# پہچان

(ناول)

مصنف

انور سہیل

مترجم

محمد نہال افروز

# پہچان

(ناول)

مصنف

انور سہیل

مترجم

محمد نہال افروز

# PEHCHAN

**(NOVEL)**

by

***Anwer Sohail***

***Translated by***

***Mohammed Nihal Afroz***

**Year of Edition 2016**

**ISBN 978-93-5073-995-2**

**Rs-150/-**

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | پہچان (ناول) |
| مصنف | : | انور سہیل |
| مترجم | : | محمد نہال افروز |
| سنہ اشاعت | : | ۲۰۱۶ء |
| قیمت | : | ۱۵۰ روپے |
| مطبع | : | روشان پرنٹرس، دہلی۔۶ |

***Published by***

**EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE**

**3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)**

**Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540**

**E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com**

# انتساب

ابو، امی اور بڑے بھائی محمد شفیق

کے نام

جن کی محبتوں، شفقتوں اور حوصلوں نے مجھے اس قابل بنایا

’’جب تخلیقی عمل سست روی کا شکار ہو اور نئے نظریات اور جذباتی پیراؤں کی تشکیل و تدوین کی اہلیت کسی قدر سلب ہو چکی ہو تو اس وقت خیالات کی ترویج اور نظریات کی تشکیل غیر ملکی ادب، فلسفہ اور دیگر شعبہ ہائے تخلیقات کے ذریعہ متواتر تراجم کی ضرورت نہ صرف ایک اجتماعی تقاضے کی سطح پر اُبھرتی ہے بلکہ ادبی اور علمی سطح پر بھی ناگریز ہو جاتی ہے۔‘‘

(انیس ناگی)

# انور سہیل: مختصر تعارف

| | | |
|---|---|---|
| نام | : | انور سہیل |
| پیدائش | : | 9 اکتوبر 1964 |
| مقام پیدائش | : | جانج گیر، چھتیس گڑھ |
| والد کا نام | : | عبدالغفار انصاری |
| والدہ کا نام | : | مرحومہ زاہدہ اسماعیل |
| تعلیم | : | پالی ٹیکنیک (ڈپلوما) |
| ملازمت | : | کول انڈیا لمیٹڈ، سینئر مینجر |
| شادی | : | 1993 |
| بیوی کا نام | : | ناظرہ پیکر |
| اولادیں | : | حنا فردوس، صبا شاہین |
| پہلی کہانی | : | ننھا شیر |

کہانیوں کے مجموعے:

1- کنجڑ قصائی

2- گیارہ ستمبر کے بعد

3- چہلم

4- گہری جڑیں

ناول:

1- پہچان

2- میرے دکھ کی دوا کرے کوئی (زیرِ طبع)

3- بلوٹی (زیرِ طبع)

شاعری کے مجموعے:

1- اور تھوڑی سی شرم دے مولا

2- سنتو کا ہے کی بے چینی

3- کچھ بھی نہیں ہے (زیرِ طبع)

مستقل پتہ : 4/3، آفیسرس کالونی، پوسٹ بجری، ضلع انوپ پور
پن- 484440 (مدھیہ پردیش)

موبائل نمبر : 09597390183

ای میل : anwarsuhail_09@yahoo.co.in

ویب سائٹ : http://www.rachnasansaar.blogspot.in

محمد نہال افروز

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

انور سہیل

# ناول پہچان لکھنے سے پہلے

ویسے تو میں مسلسل نظمیں اور کہانیاں لکھ رہا تھا۔ ہنس میں تین کہانیاں آ چکی تھیں۔ اب میں اپنی تحریروں سے مطمئن تھا۔ کیونکہ کانپور سے نکلنے والے منی رسالے کے مدیر مرحوم 'سنیل کوشش' نے جب میری پہلی کہانی منظور کی تھی تب کہا تھا کی ہنس میں شائع ہونا کہانی کار کی کسوٹی ہے۔ آپ کو ہنس پڑھنا اور کہانی کے نئے رجحان کو گرفت میں لانا ہوگا۔ ان کے مشورے سے میں نے اثر لیا تھا۔ اب ایسے ایڈیٹر کہاں کہ بنتے ہوئے مصنف کو کھاد پانی دیں۔

تو میں بتا رہا تھا کی کہانیاں چھپنے لگیں۔ آ کار، انیہ تھا، کتھا بمب، کتھا دیش میں کہانیاں آ چکی تھیں۔

میں خود کو بچپن سے ایک ناول نگار کے طور پر قائم ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے پاس سنگرولی کی سرزمین پر ناول کا خاکہ تیار ہو گیا تھا۔ ضرورت تھی صرف ایک بار طبیعت سے پتھر اچھالنے کی...... میں نے اپنے دل میں ناول نگار بننے کی تڑپ کو محسوس کیا.....

میرا ارادہ طویل ناول لکھنے کا نہیں تھا۔

مختصر ناول یا ناولٹ لکھنا ہی میرا مقصد تھا۔

ایسا گٹھا ہوا پلاٹ کہ قاری ایک بار شروع کرے تو پھر پورا پڑھ کر ہی رُکے......

جیسا کہ دوستویفسکی کے ناولوں میں ہوتا ہے...

جیسا کہ نرمل ورما کے ناولوں میں ہوتا ہے...
جیسا کہ امرتا پریتم کے ناول میں ہوتا ہے...
جیسا کہ کرشن سوبتی کے ناولوں میں ہوتا ہے...
ایسا تھا میرا خواب......اور اس کے لیے مجھے بڑی سختی سے اپنے لکھے ہوئے کو کاٹنا بھی تھا......

جب میں سنگرولی کی کوئلہ کانوں میں کام کرتا تھا، تبھی ''پہچان'' کا آئیڈیا ذہن میں آیا تھا۔ یہ بات سنہ 1990ء کی ہے۔

تب تک میں شاعر سے کہانی کار بن چکا تھا۔ کتھا نک، ہنس، کتھا بمب، اکچھ پرو میں میری کہانیاں شائع ہو چکی تھیں۔ ارادہ تھا کی اب ناول پر طبع آزمائی کی جائے۔

میں نے ایک رجسٹر لیا اور اس کے پہلے صفحے پر ناول کا خاکہ تیار کیا۔
مجھے منٹو یاد آئے اور میں نے رجسٹر میں آغاز تحریر سے پہلے 786 لکھا۔
جیسا کہ منٹو کرتے تھے۔
میں نے ناول کا عنوان سوچا اور بڑے بڑے حروف میں لکھا
--چھلانگ--
اس میں یونس کی کہانی شروع ہوئی۔
پھر کام رک گیا۔
شعبے کے امتحانات آتے رہے اور نظمیں کہانیاں وقت کھاتے رہے۔
پھر 1993 میں میری شادی ہوگئی۔
1994 میں، میں پھر رجسٹر کے صفحات الٹنے پلٹنے لگا۔
یونس کے ساتھ اب سلیم کا کردار کھلا۔
یونس کے خالہ خالو آئے اور ناول 40 صفحات کا ہو گیا۔
پھر میں زیر زمین کوئلے کی کان میں تربیت کے لیے آیا۔ ڈیڑھ سال اس میں لگے۔
رجسٹر کے صفحات میں قید یونس بھی گپ چپ طریقے سے تشکیل پا تا رہا۔

انور سہیل

# پہچان

## ایک

یونس ایک بار پھر بھاگ رہا ہے۔
ٹھیک اسی طرح اس کا بھائی سلیم بھی بھاگا کرتا تھا۔
لیکن کیا بھاگنا ہی اس کے مسئلہ کا حل ہے؟
یونس نے اپنا سر جھٹک دیا۔
خیالات کی جنگ سے بچنے کے لیے وہ یہی طریقہ اپناتا۔
اس وقت وہ سنگرولی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔
سنگرولی ریلوے اسٹیشن۔
ابھی رات کے گیارہ بجے ہیں۔
کٹنی، چوپن پینجر رات بارہ کے بعد ہی آئے گی۔
پلیٹ فارم قبرستان بنا ہوا ہے۔ سردی کی چادر اوڑھ کر سویا قبرستان۔ دھندلی روشنی میں کہرے کی ہلتی ہوئی چادر۔ لوگ چلتے تو یوں لگتا جیسے قبروں کا رکھوالا آکر دورہ کر جاتا ہو۔ جہاں ایسا لگتا ہے کہ قبروں سے اٹھ کر روحیں کالے، سفید کپڑے سے بدن لپیٹے گشت کر رہی ہوں۔
آج کل بھیڑ کی کوئی وجہ نہیں ہے۔
کٹنی، چوپن پینجر کی یہی تو پہچان ہے کہ بوگیوں اور مسافروں کی تعداد برابر ہوتی ہے۔

یونس کو بھیڑ کی پرواہ بھی نہیں۔
سفر میں سامان کی حفاظت کا بھروسہ ہو جائے تو وہ بیٹھنے کی جگہ بھی نہ مانگے۔
اس کے پاس سامان بھی کیا ہے؟ ایک ائیر بیگ ہی تو ہے۔
اسے کہیں بھی ٹکا کر وہ گھوم پھر سکتا ہے۔
دسمبر کی کڑکڑاتی سردی...
دکھائی دینے والا ہر آدمی سکڑا سمٹا ہوا۔ بدن پر ڈھیروں کپڑے لادے۔ پھر بھی سردی سے کپکپائے جا رہے ہیں۔

اِدھر سردی کچھ زیادہ پڑتی بھی ہے۔ 'دبگھیل کھنڈ' کا علاقہ ہے یہ! دانتوں کو کڑکڑا دینے والی سردی کے لیے مشہور سنگرولی کا ریلوے اسٹیشن! پہاڑی علاقہ، کوئلہ کان اور پاور پلانٹ یونٹس کی وجہ سے گویا جان بچ جاتی ہے، ورنہ ایسی سردی پڑتی کہ اچھے خاصے لوگ ٹیں بول جائیں۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے بغل میں فرسٹ و رسیکنڈ کلاس کے مخصوص مسافروں کے لیے انتظار گاہ ہے۔ دروازے میں لگے شیشے پر دھند چھا گئی تھی، اس لیے یونس نے نیم بند دروازے کو دھکیل کر اندر جھانکا۔

وہاں ایک ادھیڑ عمر کا مرد اور ایک عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ این ٹی پی سی یا پھر کالری کا صاحب ہو۔ ویسے بھی کسی ایرے غیرے کے لیے انتظار گاہ کا کمرا نہیں کھولا جاتا۔

انتظار گاہ کے بغل میں رنیگ اسٹاف کا کمرہ تھا۔ پھر اس کے بعد آر پی ایف کے جوانوں کے لیے کمرا تھا۔

اس کمرے کے باہر نائٹ ڈیوٹی کے ملازمین نے سکڑی میں آگ جلا رکھی تھی۔ چار آدمی آگ تاپ رہے تھے۔ ان کے درمیان میں تھوڑی سی جگہ بچی تھی، جہاں ایک کتا اپنا بدن سینک رہا تھا۔ یونس کتے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سکڑی کی آنچ کی سیکائی سے اسے کچھ راحت ملی۔

ریلوے کے ملازم اپ ڈاؤن، اے ای این، سائرن، ڈریل، سگنل وغیرہ الفاظ کا استعمال کر کے اپنے خیالات کا تبادلہ کر رہے تھے۔

مفلر سے آنکھ چھوڑ پورا چہرہ لپیٹے ایک ملازم بولا -'' بھائی جان، آج شام طبیعت کچھ ڈاؤن لگ رہی تھی۔ کڑک چائے بنا کر پی لیکن پک اپ نہ بنا۔ ایسے سگنل ملے کہ لگا اس بار پائلٹ

ڈریل ہوا، تو پھر اٹھانا مشکل ہوگا۔ تبھی دماغ میں سائرن بجا اور فوراً بھٹی پر پہنچے۔ وہاں فورڈاؤن والا مسروا گارڈ مل گیا۔ دونوں نے مل کر موڑ بنایا۔ تب جا کر جان بچی۔"

یونس تھوڑی دیر ان کی بات سے لطف اٹھاتا رہا، پھر اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔

باہر ایک بڑا سا پارک ہے۔ پارک کے دونوں طرف دو سڑکیں نکلی ہیں۔ دونوں سڑکیں آگے جا کر مین روڈ سے ملتی ہیں۔

پارک کے سامنے روڈ کے کنارے کنارے، ایک لائن سے کئی ٹیکساں اور ایک منی بس کھڑی تھی۔ ان ٹیکیوں یا منی بسوں کے ڈرائیور عموماً ان کے مالک ہوتے ہیں۔

ایک درخت کا موٹا سا خشک تنا سلگائے وہ آگ سینک رہے تھے۔

ایک خلاصی نما چیلا دچلم بنا رہا تھا۔

یونس وہاں رکا نہیں۔

وہ بائیں طرف کی ڈھال دار سڑک پر چل پڑا۔ مین روڈ کے اس پار تین چار ہوٹل ہیں۔

یہ ہوٹل چوبیس گھنٹے سروس دیتے ہیں۔ ان ہوٹلوں میں لالٹین جل رہی تھی۔

اس نے ہوٹل کا جائزہ لیا۔ پہلے کو چھوڑ دوسرے ہوٹل میں ایک عورت بھٹی کے پاس کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

یونس اسی ہوٹل میں جا گھسا۔

سیدھے بھٹی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کندھے پر ٹنگا ایئر بیگ اتار کر ایک کرسی پر رکھ دیا۔ پھر ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے آگ تاپنے لگا۔

خاتون نے اسے گھور کر دیکھا۔

یونس کو اس کا گھورنا اچھا لگا۔

وہ تیس بتیس سالہ خاتون تھی۔ بھٹی کی لال آنچ اور لالٹین کی پیلی روشنی کے امتزاج سے اس کا چہرہ بھلا لگ رہا تھا۔ جیسے تانبے کی سنہری چمک لیے کوئی تانبے کی مورتی۔

خاتون نے چائے کیتلی میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا چاہیے؟"

یونس نے مزہ لینا چاہا۔ "یہاں کیا کیا ملتا ہے؟"

خاتون نے اس کو گھور کر دیکھا، پھر جانے کیا سوچ کر ہنس دی۔

ہوٹل کے تین حصے تھے۔آدھے حصے میں گاہک کے بیٹھنے کی جگہ۔آدھے حصے کو دو حصوں میں ٹاٹ کے پردے سے الگ کیا گیا تھا۔سامنے کا حصہ رسوئی کے طور پر تھا اور باقی آدھے حصے میں لگتا ہے، اس کی آرام گاہ تھی۔

آرام گاہ سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز آئی، ساتھ ہی لرزتی آواز میں ایک سوال۔''پیسنجر آ گئی کا؟''

عورت نے جواب دیا۔''ابھی نہیں۔''

یونس کو ٹائم پاس کرنا تھا، سو اس نے آڈر دیا۔''کڑک چائے، چینی پتی تیز رہے گی۔''

خاتون اس کی منشا سمجھ گئی۔

اس نے برتن میں اسپیشل چائے کے لیے دودھ ڈالا اور پھر ڈھیر ساری پتی ڈال کر چائے خوب کھولا دی۔

چائے اس نے دو گلاسوں میں انڈیلی۔

ایک چائے یونس کو دی اور دوسری خود پینے لگی۔

یونس نے محسوس کیا کہ سردی اتنی زیادہ ہے کہ چائے گلاس میں زیادہ دیر گرم نہ رہ پائی۔

یونس نے چسکی لیتے ہوئے چائے کا لطف اٹھایا۔

اسے اپنے ''ڈاکٹر استاذ'' کی بات یاد ہو آئی...

ڈوجر آپریٹر شمشیر سنگھ عرف ''ڈاکٹر استاذ'' کو سردی نہیں لگتی تھی۔ وہ کہا کرتا کہ سردی کا علاج آگ یا گرم کپڑے نہیں بلکہ شراب، شباب اور کباب ہے۔

یونس نے شراب تو کبھی چھوئی نہیں تھی، لیکن شباب یا کباب سے اسے گریز نہ تھا۔

شباب کے لیے تو ویسے بھی سنگرولی علاقہ بدنام ہے۔

صنعتی ترقی کی آندھی کی وجہ سے ملک بھر کے صنعتکار، تاجر، ٹیکنوکریٹ اور ہنر مند نیز غیر ہنر مند مزدوروں کا مجمع سنگرولی علاقے میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔ پہلے تو لوگ بغیر پریوار کے یہاں آتے ہیں۔بغیر رہائشی انتظامات کے یہ لوگ ہر طرح کی ضرورت کے متبادل انتظام کے اڈے تلاش کر لیتے ہیں۔اسی لیے یہاں ایسے کئی خفیہ اڈے ہیں جہاں جسم کی بھوک مٹائی جاتی ہے۔

ایسے ہی ایک اڈے سے حاصل تجربے کو یونس نے یاد کیا۔

☆☆

## دو

کلو نام تھا اس کا۔ وہ 'بینا' کی کھلی کوئلے کی کان میں کام کرتا تھا۔

یونس تب وہاں کوئلہ ڈپو میں پیلوڈور چلایا کرتا تھا۔ وہ پرائیویٹ کمپنی میں بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتا تھا۔ تنخواہ نہیں کے برابر تھی۔ شروع میں یونس ڈرتا تھا، اس لیے ایمانداری سے تنخواہ پر دن گزارتا تھا۔

تب اگر خالہ خالو کا آسرا نہ ہوتا تو وہ بھوکوں مر گیا ہوتا۔

پھر آہستہ آہستہ ساتھیوں سے اس نے مالک، منیجر، منشی کی نگاہ سے بچ کر پیسے کمانے کا فن سیکھ لیا۔ وہ پیلوڈور یا پوکلین سے ڈیزل چرا کر فروخت کرنے لگا۔ دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں یونس کم ڈیزل چوری کرتا، کیونکہ وہ دارو نہیں پیتا تھا۔

کلو اس سے ڈیزل خریدتا تھا۔

کان کی سرحد پر آباد گاؤں میں کلو کی ایک آٹا چکی تھی۔ وہاں بجلی نہیں تھی۔ چوری کے ڈیزل سے وہ چکی چلایا کرتا۔

آہستہ آہستہ ان میں دوستی ہو گئی۔

اکثر کلو اس سے فی لیٹر کم دام لینے کی اپیل کرتا کہ کس کے لیے کمانا بھائی۔ ''جورو نہ جاتا پھر کیوں اتنا کماتا۔'' ان میں خوب بنتی۔

فرصت کے وقت یونس ٹہلتے ٹہلتے کلو کے گاؤں چلا جاتا۔

کالونی کے دکن کی طرف، ہائی وے کی دوسری طرف ٹیلے پر جو گاؤں دکھتا ہے، وہ کلو کا گاؤں 'پرستولا' تھا۔

پرسٹولا یعنی گاؤں کے کنارے یہاں پلاش کے درختوں کا ایک جھنڈ ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح کے کئی گاؤں علاقے میں ہیں جو کہ اپنی حد میں کچھ خاص درختوں کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں، جیسے کہ مہوارٹولا، آماڈانڈ، املیا، برٹولا وغیرہ۔ پرسٹولا گاؤں میں پھاگن کے استقبال میں پلاش کے درخت لال سرخ پھولوں کا شررنگار کرتے تو پرسٹولا دور سے پہچان میں آجاتا۔

پرسٹولا کے مغربی جانب 'رہند باندھ' کا پانی ہلوریں مارتا۔ ساون، بھادوں میں تو ایسا لگتا کہ باندھ کا پانی گاؤں کو جذب کر لے گا۔ کوار، کارتک میں جب پانی گاؤں کی مٹی کو اچھی طرح بھگو کر واپس لوٹتا تو پرسٹولا کے باشندے اس زمین پر کھیتی کرتے۔ دھان کی اچھی فصل ہوا کرتی۔ پھر جب دھان کٹ جاتا تو اس نم جگہ پر کسان ارہر چھینٹ دیا کرتے۔

رہند باندھ کو 'گووندولبھ پنت ساگر' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ رہند باندھ تک آکر 'ریڑ ندی' کا پانی رکا اور پھر چوڑائی میں چاروں طرف پھیلنے لگا۔ شروع میں لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ پانی اس طرح پھیلے گا کہ جل تھل سب برابر ہو جائے گا۔

اس علاقے میں ویسے بھی جاگیردانہ نظام کی وجہ سے جمہوری قیادت کا فقدان تھا۔ عام ذرائع مواصلات کی ایسی کمی تھی کہ لوگ آزادی ملنے کے بعد بھی کئی برس تک نہیں جان پائے تھے کہ انگریزی راج ختم ہوا۔ 'گہروار' بادشاہوں کی شان وشوکت کے قصے ان گاؤں کے باشندوں کی جگالی کا سامان تھے۔

پھر آزاد ہندوستان کا ایک بڑا انعام ان لوگوں کو یہ ملا کہ انہیں اپنی جنم بھومی سے بے گھر ہونا پڑا۔ وہ تام جھام لے کر در در کے بھکاری ہو گئے۔ ایسی جگہ بھاگ جانا چاہتے تھے کہ جہاں قیامت آنے تک ڈوبنے کا خطرہ نہ ہو۔ ایسے میں مورووا، بیڑھن، رینوکوٹ، میور پور، ببھنی، چپکی وغیرہ پہاڑی علاقے کی طرف وہ اپنا ساز وسامان لے کر بھاگے۔ اب وہ کچھ راحت کی سانس لینا ہی چاہتے تھے کہ کوئلہ نکالنے کے لیے کوئلہ کمپنیوں نے ان سے اس جگہ کو خالی کرانا چاہا۔ پاور پلانٹ فیکٹری والوں نے ان سے زمینیں مانگی۔ وہ بار بار اجڑتے، بستے رہے۔

کلو کے بوڑھے دادا ڈوب کی دہشت گردی سے آج بھی خوفزدہ ہو اٹھتے تھے۔ ان کے دماغ سے سیلاب اور ڈوب کے منظر ہٹائے نہیں ہٹتے تھے۔ ہٹتے بھی کیسے؟ ان کے گاؤں کو، ان کی پیدائشی زمین کو، ان کے بزرگوں کی قبرگاہوں، سمادھیوں کو اس نامراد باندھ نے برباد کر دیا تھا۔

یہ نقل مکانی ایسی تھی جیسے کسی بڑے جڑ جمائے درخت کو ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگایا جائے...

کیا اب وہ لوگ کہیں بھی جم پائیں گے؟

کلو کے دادا کی آنکھیں بھیگ جاتیں جب وہ اپنے نقل مکانی کی درد کا ذکر کرتے تھے۔ جانے کتنی بار اسی ایک کہانی کو الگ الگ اقساط پر ان کے منھ سے یونس سن چکا تھا۔

دادا ایک معمول سے دیہاتی تھے۔ خالی نہ بیٹھتے۔ کبھی کیاری کھودتے، کبھی گھاس پات اکھاڑتے یا پھر جھاڑو اٹھا کر آنگن بہارنے لگتے۔

دبلا پتلا جسم، جھکی کمر، چہرے پر جھریوں کا اندر جال، آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ، بدن پر ایک بنیان، لٹھے کی پردھنی، کندھے پر یا پھر سر پر پڑا ایک اگونچھا اور چلتے پھرتے وقت ہاتھوں میں ایک لاٹھی۔

وہ بتاتے کہ اس سال برسات اتنی زیادہ ہوئی کہ لگا اندر دیو ناراض ہو گئے ہوں۔ آسمان میں کالے پنیلے بادلوں کا دہشت گرد قہر برساتا رہا۔ بادل گرجتے تو پورا علاقہ تھرا جاتا۔

یونس بھی جب سنگرولی علاقے میں آیا تھا تب پہلی بار اس نے بادلوں کی اتنی تیز گڑ گڑاہٹ سنی تھی۔ شہڈول ضلع میں پانی برستا ہے لیکن بادل اتنی تیز نہیں گڑگڑایا کرتے۔ شہڈول ضلع میں بارش بغیر وقت کے نہیں ہوتی۔ مان سون کے وقت میں خاص وقفے پر پانی برستا ہے۔ جبکہ سنگرولی علاقے میں اس طرح سے بارش نہیں ہوتی۔ وہاں اکثر ایسا لگتا ہے کہ شاید اس برس بھی بارش نہیں ہوگی۔ ایک ایک کر کے بادلوں کے پرے کے پرے نکلتے جاتے ہیں اور اچانک کوئی بادل ایسا برستا ہے کہ سارے امکانات تباہ ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ بادل پھٹ پڑیں گے۔ اچانک آسمان سیاہ، اندھیرا ہو جاتا ہے۔ پھر بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک کے ساتھ ایسی شدید برسات ہوتی کہ لگتا جل تھل سب برابر ہو جائے گا۔

ویسے ادھر ادھر سے آتے جاتے لوگوں سے خبر ملتی رہتی کہ پانی آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے۔ لیکن کسے پتہ تھا کہ ان پرا، بیج پور، میور پور، بیڑھن، کوٹا، بھنی، چپکی تک پانی کے پھیلنے کا امکان ہو جائے گا۔

تب ملک میں مواصلاتی انقلاب کہاں آیا تھا؟ کہاں تھا معلومات کا مہا دھماکہ؟ تب

کہاں تھا انسانی حقوق کمیشن؟ تب کہاں تھے تحفظ ماحولیات کے تصورات؟ تب کہاں تھے سروے کرتے کراتے طفیلی این جی او؟ تب کہاں تھے مہاجرین کو حق اور انصاف دلاتے قوانین؟

نہرو کی کرشمائی شخصیت کا دور تھا۔ ملک میں کانگریس کی مکمل حکومت۔ نئی نئی جمہوریت میں بغیر پڑھے لکھے ہوئے، غربت اور بھوک، بیکاری، بیماری اور توہم پرستی سے جوجھتے ملک کے اسی فیصد دیہی باشندوں کو ووٹ کا جھنجھنا پکڑا دیا گیا۔ ان کی ترقی کے لیے دارالحکومت میں ایک سے بڑھ کر ایک منصوبے بن رہے تھے۔ اپنی تعریف کے کتابیات لکھے جا رہے تھے۔

انگریزی راج سے دہشت کھائے ہندوستانی عوام نے نہرو حکومت کو مکمل موقع دیا تھا کہ وہ آزاد ہندوستان کو آزاد اور خودمختار بنانے میں من پسند فیصلہ لیں۔

ملک میں جمہوریت تو تھی لیکن بغیر کسی مضبوط اپوزیشن کے۔

اسی لیے ایک طرف جہاں بڑے بڑے عوامی ادارے کھل لے رہے تھے وہیں دوسری طرف بڑے امیر طبقوں کو سرمایہ کاری کا موقع مل رہا تھا۔

یعنی نہرو کا سماجوادی اور سرمایہ دارانہ ترقی کا ملا جلا ماڈل۔

آگے چل کر ایسی کئی عوامی تنصیبات کو بعد کی حکومتوں نے بعض وجوہات کی بنا پر اپنے چہیتے امیر طبقوں کو کوڑی کے بھاؤ فروخت کرنے کی سازش کی۔

پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ جہاں آج باندھ ہے وہاں ایک بڑا شہر تھا۔ گہروار راجا کی ریاست تھی۔ کیوٹ لوگ بتاتے ہیں کہ ابھی بھی ان کے محل کا گنبد نظر آتا ہے۔

گہروار راجا بھی ہوشیار نہیں تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کا گڑا ہوا خزانہ ڈوب گیا ہے۔

اصل سنگرولی تو باندھ میں سما چکی ہے۔

آج جسے لوگ سنگرولی نام سے پکارتے ہیں وہ اصل میں مورواہے۔

تبھی تو جہاں سنگرولی کا بس اسٹینڈ ہے اسے مقامی لوگ 'پنجرے بازار' نام سے پکارتے ہیں۔

کلو کے دادا سے خوب غپ لڑایا کرتا تھا یونس۔

وہ بتایا کرتے کہ غرق آب سنگرولی ریاست میں تمام مذہب، ذات کے لوگ بستے تھے۔

سنگرولی ریاست دھن دولت سے معمور تھی۔

تیج تہوار، ہاٹ بازار اور میلا ٹھیلا ہوا کرتا تھا۔ تب اس علاقے میں بڑی خوشحالی تھی۔ لوگوں کے تقاضے محدود تھے۔ پھر کلو کے دادا راج کپور کا ایک گیت گنگناتے -''زیادہ کی لالچ ہم کو نہیں، تھوڑا میں گزارا ہوتا ہے۔''

مرزاپور، بنارس، ریوا، سیدھی اور امبیکاپور سے یہاں کے لوگوں کا رابطہ بنا ہوا تھا۔

یونس مسلم تھا اس وجہ سے ایک بات وہ خاص طور سے بتاتے کہ سنگرولی میں محرم بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔

سبھی لوگ مل جل کر تعزیہ سجاتے تھے۔

خوب ڈھول تاشے بجائے جاتے۔

تینک تکڑ......دھمک تکڑ......

سینک سکر......سینک سکر......

دودھ ملیدا......دودھ ملیدا...

کھچڑا بٹتا، دودھ چینی کا شربت پلایا جاتا۔

سنگرولی کے گہروار راجا کا بھی منوتی تعزیہ نکلتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھائی بھی شہدائے کربلا کی یاد میں اپنی ننگی چھاتی پر ہتھیلی مار کر ماتم کرتے۔

یا حسین... یا حسین...... یا حسین......

کلو کے دادا بتاتے کہ اس ماتم کی وجہ سے خود ان کی چھاتی لہولہان ہو جایا کرتی تھی۔ وہ لاٹھی بھاجنے کے فن میں ماہر تھے۔ تعزیہ ملن اور کربلا لے جانے سے پہلے اچھا اکھاڑا ہوتا تھا۔ سینکڑوں لوگ آ جٹتے تھے۔ تھکتے نہیں کہ سبیل شربت پی لیتے، کھچڑا کھا لیتے۔ ریوڑی اور الائچی دانے کی شیرنی کھاتے کھاتے اوبھ جاتے تھے۔

یونس نے بھی بچپن میں ایک بار دم بھر کر ماتم کیا تھا، جب وہ اماں کے ساتھ 'امریا' کا تعزیہ دیکھنے گیا تھا۔ سلیم بھائی تو تعزیہ کو مانتا نہ تھا۔ اس کے مطابق یہ جہالت کی نشانی ہے۔ ایک طرح کا شرک (اللہ کے علاوہ کسی دوسری ذات کو عبادت کے لائق بنانا) ہے۔ خیر، تعزیہ کی علامتی عبادت ہی تو کرتے ہیں مجاور وغیرہ...

یونس نے سوچا کہ اگر لوگ اس تعزیہ کو سر جھکا کر نمن کرتے ہیں تو کہاں منع کرتے ہیں مجاور! ان کا تو دھندہ چلنا چاہیے۔ ان کا ایمان تو چڑھوتی میں ملنے والی رقم، فاتحہ کے لیے آئی چیزیں اور لوگوں کے جذبات کا کاروباری استعمال کرنا ہی تو ہوتا ہے۔ سال بھر اس تہوار کا وہ بیتابی سے انتظار کرتے ہیں۔ ہندو مسلمان سبھی محرم کے تعزیے کے لیے چندہ دیتے ہیں۔

'امریا' میں تو ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت تعزیے بنائے جاتے ہیں۔ لاکھوں کی بھیڑ جمع ہوتی ہے۔ عورتوں اور مردوں کا ہجوم۔ خوب کھیل تماشے ہوا کرتے ہیں۔ جیسے جیسے رات گھرتی جاتی ہے، ماتمی لباس اور مرثیہ کا تہوار اپنا رنگ جماتا جاتا ہے۔ کئی ہندو بھائیوں پر سواری آتی ہے۔ لوگ انگلیوں کے درمیان بلیڈ کے ٹکڑے دبا کر ننگی چھاتیوں پر حملہ کرتے ہیں، جس سے جسم لہولہان ہو جاتا ہے۔

ایرانی لوگ جو چاقو، چھری، چشمہ وغیرہ کی پھیری لگا کر فروخت کرتے ہیں، ان کا ماتم دیکھ کر تو دل دہل جاتا ہے۔ وہ لوگ لوہے کی زنجیروں پر کانٹے لگا کر اپنے جسم پر حملہ کر کے ماتم کرتے ہیں۔

کچھ لوگ شیر بنتے ہیں۔

شیر کا ناچ یونس کو بہت پسند آیا تھا۔

رنگ برنگی پلاسٹکوں اور کاغذوں کو تراش کر بنائے گئے خوبصورت تعزیے کے نیچے سے لوگ پار ہوتے۔ ہندو اور مسلم عورتیں، بچے اور آدمی سبھی بڑی عقیدت کے ساتھ تعزیے کے نیچے سے نکلتے۔ یونس نے دیکھا تھا کہ ایک جگہ ایک خاتون تعزیہ کے سامنے اپنے بال بکھرائے جھوم رہی ہے۔

ڈوب میں آباد قصبے میں محرم کے منائے جانے کا کچھ ایسا ہی منظر کلو کے دادا بتایا کرتے تھے۔

لوگوں کی زندگی خوشحال تھی۔

ربیع اور خریف کی اچھی کھیتی ہوا کرتی تھی۔

اس علاقے کی خوشحالی پر اچانک گہن لگ گیا۔

لوگوں نے سنا کہ اب یہ علاقہ پانی سے بھر جائے گا۔

کسی نے اس بات پر یقین نہیں کیا۔

سرکاری منادی ہوئی تو بڑے بزرگوں نے بات کو ہنس کر بھلا دیا۔ ابھی تو ملک آزاد ہوا ہے۔ انگریز بھی ایسا کام نہ کرتے، جیسے آزاد ہندوستان کے رہنما کرنے والے تھے۔

اس بات پر کون یقین کر سکتا تھا کہ گاؤں کے گاؤں، گھر بار، کام کاروبار، مندر، مسجد، قبرستان تمام پانی سے بھر جائیں گے۔ اور تو اور گھروار راجا کا محل بھی ڈوب جائے گا۔

اتر پردیش اور مدھیہ پردیش کی سرحد پر آباد سنگرولی علاقہ۔ اس علاقے کے لوگوں کی فکر اتر پردیش کی حکومت کو تھی اور نہ ہی مدھیہ پردیش کی حکومت کو۔

رینوکوٹ میں باندھ بن کر تیار ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ پانی کی سطح بڑھ رہی تھی۔ حکومتیں خاموشی سے ڈوبنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ مقامی لوگ ذہنی طور پر یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب انہیں اپنے آباؤ اجداد کی سمادھیوں کو، اپنے سارے دیوتاؤں کو، اپنی پیدائشی زمین کو چھوڑنا پڑے گا۔ اپنے وطن سے انہیں بے دخل ہونا پڑے گا۔ نقل مکانی کا دکھ جھیلنا پڑے گا۔

لوگوں کو کہاں معلوم تھا کہ ملک کے ایک بڑے صنعتکار 'برلا' کی خواہش ہے کہ انہیں ایلومینیم بنانے کا ایشیا کا مشہور پلانٹ یہیں ڈالنا ہے، کیونکہ یہ ایک پسماندہ علاقہ ہے۔ یہاں کسی طرح کی سیاسی مداخلت نہیں ہوگی۔ کسی طرح کی سرکاری رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کم سے کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ منافع کا موقع وہاں تھا۔

ہوائی جہاز کے ذریعے اس علاقے کی قدرتی املاک کا اندازہ ہو چکا تھا۔

برلا جی کے ذریعے لاکھوں ایکڑ جنگلی زمین پر قبضہ ہو چکا تھا۔ پلانٹ کے لیے آلات درآمد کیے جا رہے تھے۔

جدید دور کے صنعتی کام ہوں گے، نہرو کا نیا محاورہ ملک کی فضا میں گونج رہا تھا۔

نہرو کی طلسمی شخصیت کے لیے ملک میں کوئی چیلنج نہ تھا۔

گاندھی، نہرو کے دوست برلا جی کو اپنے مستقبل کی صنعت کے لیے چاہئے تھی سستی زمین، درآمد ساز و سامان اور کافی مقدار میں بجلی۔

بجلی کے لیے ضروری تھا پانی اور کوئلہ۔

پانی کے لیے تو نہر و بنوا ہی رہے تھے باندھ اور ایندھن کے لیے سنگرولی علاقے میں تھا کوئلے کا بے شمار بھنڈار۔

سنگرولی علاقے میں ہے ایشیا کی سب سے موٹی کوئلہ پرتوں میں سے ایک پرت ''جھینگر دہ سیم'' جو کہ تقریباً ایک سو پچاس میٹر موٹی ہے۔

جھینگر دہ کان سے کوئلہ ''ایریل روپ وے'' کے ذریعے برلا جی کے پاور پلانٹ ''رینو ساگر'' میں آتا۔ رینو ساگر میں ہیٹنگ بجلی تکنیک سے بجلی بنتی جسے براہ راست رینوکوٹ میں واقع ایلومینیم فیکٹری میں بھیجا جاتا تھا۔

کوئلے کی صنعت کاری کو جب اندرا گاندھی نے نیشنلائز کیا تبھی سے سنگرولی کوئلہ علاقے میں منظم طریقے سے کوئلے کی پیداوار کے منصوبے بنے۔ باندھ کے ارد گرد مدھیہ پردیش، اتر پردیش کی ریاستی حکومتوں اور این ٹی پی سی نے اپنے پاور پلانٹ کے مراکز قائم کیے۔

ایک وقت تھا جب دادا پرکھے کسی کو بددعا دیتے تو یہی کہتے تھے۔ ''جا بیڑھن کو...''

آج وہی لعنتی بیڑھن نئے صنعت کاروں، تکنیکی ماہرین، امیر طبقوں، پبلک اسکولوں، غیر سرکاری تنظیموں، مذہبی روحانی تاجروں وغیرہ کے لیے جنت بنا ہوا ہے۔

ایک سے بڑھ کر ایک ہر آسائش سے بھرپور نئے نئے شہر قائم ہو رہے ہیں۔ بیڑھن میں زمین کی قیمتیں آسمان چھو رہی ہیں۔

آج سنگرولی ایک پاور پلانٹ کے روپ میں یاد کیا جاتا ہے۔

# تین

کلو کے گاؤں کے نیچے ایک نالا بہتا تھا۔ درّہ نالا۔ کان سے نکلا پانی اور کالونی سے نکلنے والا پانی نالے میں سال بھر بہتا۔ درّہ نالے کے ارد گرد ایک بستی آباد ہو گئی تھی ۔ یہ ٹھیکیدار مزدوروں کی بستی تھی۔ اس آبادی کا نام سفید پوش لوگوں نے آزادنگر دیا تھا۔

آزادنگر نام کے مطابق یہ بستی تعزیرات ہند کی دفعات، غیر دفعات وغیرہ پابندیوں سے آزاد تھی۔ اس بستی کو تمام رکاوٹوں سے آزادی ملی ہوئی تھی۔ آزادنگر میں کثرت سے دستیاب تھے۔شراب، شباب، کباب، جرائم پیشہ لوگ، بھوک بیماری، بیکاری اور سٹّے جوئے کے اڈے۔

مہذب لوگ ادھر کا رخ نہ کرتے، وہ اسے گناہ نگری کہتے۔ راون کی لنکا اور جہنم کا دروازہ کہتے۔

اس جہنم کے باشندے تھے تمام محنت کش...

یہ محنت کش کارل مارکس کے دیسی ورژن والی تمام مزدور تنظیموں کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ ان کی خوشحالی کے لیے ان مزدور تنظیموں کے پاس کوئی پروگرام نہ تھا۔ ان لوگوں کے لیے کوئی انسانی حقوق کمیشن نہ تھا۔ کوئی 'ٹاؤن پلاننگ' کمیٹی نہ تھی۔ کوئی ہسپتال، کوئی نرسنگ ہوم نہ تھا۔ ان کے لیے کوئی رکشہ اسٹینڈ یا بس اڈے نہ تھے۔ ان کے بچوں کے لیے کوئی اسکول نہ تھا۔ ان کے لیے کسی طرح کی رسمی یا غیر رسمی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔

ان کی روحانی ترقی کے لیے کوئی مولوی، پنڈت یا پادری نہ تھا۔

ان میں زیادہ تر لوگ کوئلے کے ڈھیر سے پتھر شیل چھانٹ کر الگ کرنے والے مزدور تھے۔ کان چلانے کے لیے عمارت، شہر، سڑک اور بڑے بڑے ورکشاپ وغیرہ کی تعمیر کے کام میں ملازم، سینکڑوں مزدور اور مستری۔ بجلی، مشینری، سول وغیرہ کام کے لیے ہنرمند اور غیر ہنرمند

ٹھیکیدار مزدور۔ محنت مشقت، نین مٹکا سے لے کر گانے بجانے تک میں ہنر مند لڑکیاں۔

آزاد نگر میں کچھ چھوٹے موٹے ٹھیکیداروں نے بھی اپنے آشیانے سجائے ہوئے تھے۔

پولیس تھانے کے ریکارڈ میں یہ بستی تمام جرائم کی جنم داتا کے نام سے مشہور تھی۔ اس لیے پولیس یہاں اکثر دبش کرتی اور کیس بنایا کرتی، لیکن غلط کام مکمل طور پر بند نہیں کرواتی۔ لوگ کہتے کہ اگر آزاد نگر سدھر گیا یا اجڑ گیا تو پھر محکمہ پولیس کی کمائی بند ہو جائے گی۔

کلو آزاد نگر کے اس حصے کا مستقل گاہک تھا، جہاں دارو اور شباب کا سودا ہوتا تھا۔

ایسے ہی غپ کے دوران یونس نے ایک لڑکی کے بارے میں جاننا چاہا جو سائیکل پر دندناتی پھرتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تھانے دار اور ایک بڑے ٹھیکیدار کی رکھیل ہے۔

کلو نے یونس کی طرف بے یقینی سے دیکھا- ''کا استاد، تم بھی اس چکر میں رہتے ہو؟''

یونس کیا جواب دیتا- ''تو کیا، میں آدمی نہیں ہوں کا؟''

بس، پھر کیا تھا۔

کلو ایک دن یونس کو آزاد نگر لے گیا۔

پہلے تو یونس نے نانکر کی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ بات خالو یا خالہ تک نہ پہنچے۔ اس کی گت بن جائے گی۔ اگر صنوبر اس کی یہ حرکت جان گئی تو زندگی بھر معاف نہ کرے گی۔ اس سے کتنا پیار کرتی ہے صنوبر۔

ارے، جب صنوبر کی چچیری بہن جمیلہ نے یونس کو اپنے حسن کے جال میں پھنسانا چاہا تھا تو صنوبر نے ہی اس کو بچایا تھا۔

جمیلہ یونس سے چار پانچ سال بڑی ہوگی۔ وہ شادی شدہ تھی۔ اس وقت اس کو بچہ نہ ہوا تھا۔ ایک دم پکے آم کی طرح گدرائی ہوئی تھی۔

جمیلہ میکے آئی تو خالہ سے ملنے چلی آئی۔ جمیلہ کا شوہر عرب ممالک کمانے گیا تھا۔ جمیلہ کے پاس پیسے تو بہ افراط تھے۔ اسی لیے وہ دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔ ایسے مہمان کسے برے لگ سکتے ہیں۔

جمیلہ کی خالہ سے خوب پٹتی۔ وہ جب بھی ملتیں، جانے کیا باتیں کر کے خوب ہنستیں، جیسے بچپن کی بچھڑی پکی سہیلی ہوں۔

جمیلہ کی ناک میں پڑی سونے کی لونگ میں ایک نگ گڑا تھا۔ روشنی پڑنے پر وہ خوب چمکتا ہے۔ اس کی چمک سے جمیلہ کی آنکھیں دمکنے لگتیں۔ یونس جب بھی جمیلہ کی طرف دیکھتا، اس کی ناک کی لونگ کی چمک کے طلسم میں الجھ کر رہ جاتا۔

شاید اس بات سے جمیلہ واقف تھی۔

یونس نے محسوس کیا کہ جمیلہ اس کی طرف کچھ زیادہ جھکاؤ رکھتی ہے۔ ایسا پہلے نہیں تھا۔ اب شاید یونس لڑکپن سے جوانی کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔ کام دھندہ کرنے سے اس کے جسم میں غضب کی کشش آ گئی تھی۔ تھا بھی یونس پانچ فٹ سات انچ کا گبرو جوان۔ ہلکی ہلکی مونچھیں اور بال سنجے دت جیسے۔ یونس سنجے دت کا فین تھا۔

یونس نائٹ شفٹ کھٹ کے گھر لوٹا تو گھڑی میں صبح کے دس بج رہے تھے۔ رات شفٹوں میں پیلوڈور چلانے کے بعد اگر گاڑی میں کچھ خرابی آ جائے تو اسے ورکشاپ لا کر کھڑا کرنا ہوتا تھا۔ پھر گاڑی میں جو بھی بریک ڈاؤن ہوا سے میکینک کو بتلا کر مرمت کروانا رات شفٹ کے آپریٹر کا کام تھا۔ وہاں کا سپروائزر ایک مدراسی تھا۔ بہت قانون بتیاتا تھا۔ سو اس عمل میں دیر تو ہو ہی جاتی۔

جب وہ گھر پہنچا اس وقت خالو ڈیوٹی گئے ہوئے تھے۔ خالہ کہیں پڑوس میں گپ لڑانے گئی تھیں۔ گود کے بچے چھوڑ کر پڑھنے والے تمام بچے اسکول جا چکے تھے۔

یونس نے دروازہ ڈھکیلا تو وہ کھل گیا۔

سناٹا دیکھ کر وہ بیٹھک میں رکھے تخت پر بیٹھ گیا کہ آہٹ سن کر کوئی بولے گا۔ ہو سکتا ہے کہ خالہ غسل خانے میں ہو۔

لیکن کچھ دیر تک کوئی کھٹ پٹ نہیں ہوئی تو وہ اٹھا۔ رسوئی سے ہو کر آنگن کی طرف گیا۔ آنگن میں پانی کی ٹنکی تھی، جہاں خاندان کے مرد یا پھر بچے نہاتے دھوتے تھے۔

ہاتھ منھ دھونے وہ ٹینکی کے پاس جا پہنچا۔

ابھی وہاں پہنچ کہاں پایا تھا کہ اس نے جو منظر دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

جمیلہ ٹینکی کے پیچھے کھڑے کھڑے نہا رہی تھی۔

اس کی کمر سے اوپر کا حصہ کھلا ہوا تھا۔

سانولا جوان جسم...

سانچے میں ڈھلا بدن...

یونس نے الٹے پاؤں بھاگنا چاہا، لیکن تبھی اس کی ناک کے لونگ کا نگ چمچمانے لگا۔ اس کی چمک سے نکلی کرنوں کی رسی سے یونس کے پاؤں بندھ سے گئے تھے۔

آہٹ پاکر جمیلہ یک بارگی چونکی، پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے اپنے جسم کو چھپا نہیں بلکہ دوڈبا پانی اور جسم پر ڈال لیا۔

یونس کے ہوش اڑ گئے۔

اس نے جانا کہ جمیلہ کی ہنسی میں کھلی دعوت تھی۔

جمیلہ ایک چیلنج کی طرح اس سے ٹکرائی تھی۔

گھبراہٹ میں یونس گھر سے نکل بھاگا، وہ رکا نہیں۔

وہ تب تک نہ لوٹا جب تک اسے یقین نہ ہوگیا کہ اب گھر میں خالہ اور بچے آگئے ہوں گے۔

دوپہر میں جب وہ آنگن میں چارپائی ڈالے دھوپ میں سو رہا تھا کہ اسے لگا اس کے اوپر کوئی سویا ہوا ہے۔ وہ جمیلہ تھی جو موقع پاکر یونس کو چھیڑ رہی تھی۔

جمیلہ کی چھاتیاں اس کے سینے سے آ لگی تھیں۔

یونس کی سانس اٹکنے لگی۔

جمیلہ کے ہونٹ یونس کے چہرے پر اپنا کمال دکھانے لگے۔

جمیلہ اس کے کان میں پھسپھسا کر گا رہی تھی۔

''دھیرے دھیرے پیار کو بڑھانا ہے

حد سے گزر جانا ہے......''

کیا یونس کو اس وقت تک ''حد سے گزر جانے'' کا مطلب پتہ چل پایا تھا؟

ایسا نہیں کہ یونس کوئی ولی تھا لیکن وہ اس وقت صنوبر کی آنکھوں کی جھیل میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔ صنوبر کے پلٹے ہوئے ہونٹ جب مسکراتے تو جیسے یونس کی جیب کھنکھنانے لگتی تھی۔ یونس

اچانک رئیس آدمی میں بدل جاتا تھا۔

اسے صنوبر چھوڑ کر اور کوئی دوسری لڑکی کس طرح پیاری ہوتی؟

ایک دن اس نے صنوبر سے جمیلہ کی حرکتوں کے بارے میں بتایا تو صنوبر خوب ہنسی۔ اس نے یونس کو چڑھایا کہ وہ کیسا مرد کا بچہ ہے۔ یہاں تک کہ صنوبر نے جمیلہ کے ساتھ مل کر اس کی ہنسی بھی اڑائی تھی۔

یونس اس کی محبت کے ساتھ بے وفائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اس نے اپنے لیے صبوبر کے دل میں اور زیادہ جگہ بنالی تھی۔

## چار

یونس کوئی ولی نہ تھا اور نہ ہمیشہ کے لیے با کردار رہنے کے لیے کوئی پابند عہد نوجوان۔
وہ اپنے ارد گرد کے دیگر سینکڑوں نوعمر نوجوانوں کی طرح اپنی جسمانی صلاحیتوں اور کمزوریوں کے تئیں خوف زدہ رہتا تھا۔ اس کے دل میں بدیہی تجسس تھا کہ انسان کی زندگی کا یہ کیسا باب ہے، جس کے لیے بڑے بزرگ اتنی نفرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کیا وہ وقعی ان خفیہ اعمال کے تئیں بے نیاز ہوتے ہیں؟ نہیں، بلکہ اس منفرد فطری عمل میں وہ گلے تک ڈوبے ہوتے ہیں۔
یونس ایک ایسے متوسط طبقے کے مسلم گھرانے میں پیدا ہوا تھا، جہاں دو کمرے میں پوری گرہستی سمائی ہوئی تھی۔
جہاں ماں باپ کے درمیان محبت اور نفرت ظاہر کرنے کے لیے کوئی الگ تھلگ انتظام نہ تھا۔
جہاں ہر دو چار سال کے وقفے میں ایک اولاد کی پیدائش ہونی عام بات تھی۔
جہاں بڑے بزرگ، بچوں کے سامنے محلے کے لوگوں سے کھل کر ہنسی مذاق کرتے تھے۔
جہاں عورتیں آپس میں پوشیدہ بھیدوں پر اشارتاً بات کر کے خوب لطف اٹھایا کرتیں۔
اس ہنسی مذاق میں دیور بھابھی کے رشتے سے آتی فحش کلامی عام تھی۔
بچے سمجھ جاتے تھے کہ جب سڑا کیلا پلپلا پپیتا کہا جاتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟
جب گہرا کنواں اور چھوٹی رسی کی بات کر کے بڑے لوگ ہنس رہے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟
جب کھل بٹہ سے مسالا کٹائی کی بات ہوتی ہے تو مار کہاں ہوتی ہے۔

نتیجتاً: ان خاندانوں کی بیٹیاں بے وقت نوجوان ہوکر نین مٹکا کرتے کرتے گھر سے بھاگ جاتی ہیں یا پھر بن بیاہی ماں بن جاتی ہیں۔

ان خاندانوں کے لڑکے پھوپھی خالہ، چاچی کاکی، غیر شادی شدہ بہنوں یا پھر گھریلو نوکرانیوں کے رابطے میں آکر تجرباتِ جوانی کا سبق پڑھتے ہیں۔

اسی لیے یونس کے، بچپن سے جوانی تک کے ابواب بے عیب نہ تھے۔

بینا کوئلے کی کان میں کام کرنے کے دوران کلو یونس کا قریبی دوست بن گیا۔

کلو بال بچے دار لیکن بہت لاپرواہ قسم کا نوجوان تھا۔ یونس نے اس کی بیوی کو دیکھا تھا۔ وہ موٹی ہوکر بھینس ہوگئی تھی۔

کلو کی خالہ نظر آتی تھی وہ۔

کلو کے لیے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا کر چکی تھی وہ۔

اگر سارے بچے زندہ ہوتے تو اب تک وہ پانچ بار ماں بن چکی تھی۔ ایک بار اسقاط حمل ہوا تھا۔ اب اس کے جسم میں رس نہ تھا۔ بچوں کو پال پوس لے، کلو کو بس اتنی ہی چاہت تھی اس سے۔

کلو اسی لیے ادھر ادھر منھ مارا کرتا۔

کلو نے یونس کو بھی ''ذائقہ چکھنے'' کی دعوت دی۔

وہ کہا کرتا ''تم اپنے اللہ کے پاس جاؤ گے تو اللہ پوچھے گا، زمین پر کیا کیے؟ جب تم بتاؤ گے کہ نہ میں نے دارو پی، نہ جیل گیا، نہ رنڈی بازی کی تو اللہ بڑی زور سے ہنسے گا اور دو کک مار کر اسی دنیا میں دوبارہ بھیج دے گا کہ بچو جب کچھ کیا ہی نہیں تو پھر یہاں کیسے آگئے۔''

اسی طرح کی باتیں کر کے وہ یونس کو تیار کرتا۔

اور ایک دن یونس تیار ہو ہی گیا۔

اس نے کلو کی تجویز کو ایک چیلنج سمجھا۔

حالانکہ اس کا دل اندر سے اس کے لیے تیار نہ تھا۔

کلو اسے آزاد نگر کے اُس حصے میں لے گیا جہاں جسم فروشی ہوتی تھی۔

جھونپڑیوں کی قطاریں۔ درمیان میں گلی۔ ٹھیلے پر چنا، مونگ پھلی، نمکین اور انڈے کی دکانیں۔ کچھ پان کی گمٹیاں۔ ایک جھونپڑی میں چائے سموسے کے لیے ہوٹل۔

ماحول میں عجیب طرح کی بدبو۔ جیسے کہیں کوئی جانور مرا ہو۔ ہوا میں ہلکی سی نمی پھیلی تھی۔ بارش کا موسم ختم ہوا تھا اور سردی کی آمد ہو چکی تھی۔ شام کا وقت، آسمان کا رنگ ہلکا سرخ، پیلا اور نیلا تھا۔ سارے رنگ آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے جا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ جلد ہی آسمان پہ سرمئی رنگ چھا جائے گا۔

مزدور کام سے چھوٹ کر گھر واپس آ رہے تھے۔

جھونپڑیوں کے دروازے کھلنے لگے تھے۔

مرد گھر کے باہر چارپائی ڈال کر بیٹھنے لگے تھے۔ گانجا چلم کا دور شروع ہو رہا تھا۔ دارو پینے والے مزدور بن ٹھن کر بھٹی کی طرف جا رہے تھے۔

جھونپڑیوں میں اب چولہے سلگانے کا کام شروع ہونے لگا۔ مزدور عموماً کام سے واپس آئے تھے۔ درّہ نالے میں نہا کر عورتیں، مرد اور بچے واپس آ رہے تھے۔

درّہ نالا ایک بدنام جگہ کا مترادف بن چکا تھا۔

لوگ جانتے تھے کہ یہاں صبح سے شام تک مزدور مردوں اور عورتوں کے نہانے کا پروگرام چلا کرتا ہے۔

بینا کے رہنے والے درّہ نالے کو "ویترنی" کا نام دیتے یا پھر اسے "رام تیری گنگا میلی" کہتے۔ کالونی کے بدمعاش لڑکے اسکول سے بھاگ کر درّہ نالا کے ارد گرد منڈراتے رہتے اور چھپ چھپ کر نہاتی عورتوں کو دیکھا کرتے۔

یونس سہما سہما آزادنگر کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف تھا کہ کہیں خالو کا کوئی ساتھی اسے یہاں دیکھ نہ لے، ورنہ شامت آجائے گی۔

ویسے بھی یونس کا خالو سے چھتیس کا آنکڑا تھا۔ خالو اسے پھوٹی آنکھ پسند نہ کرتے۔

کلو یونس کا ہاتھ تھامے ایک جھونپڑی کے سامنے رکا۔

یہ نچلی چھانی والی ایک معمولی سی جھونپڑی تھی۔ باہر پرچھی تھی۔ پرچھی میں ایک پلنگ بچھی تھی۔ کلو نے یونس کو پرچھی میں پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ اندر چلا گیا۔

یونس پلنگ پر بیٹھا ہی تھا کہ دو ننگ دھڑنگ بچے اس کے پاس چلے آئے۔ "مالک، چنا کھانے کو پیسہ دو نا!"

یونس نے انہیں پھٹکارا۔

وہ ہٹے نہیں، ضد پر اڑے رہے۔

تب تک کلو جھونپڑی سے باہر نکلا۔ اس نے یونس کو پریشان کرتے بچوں کی پیٹھ پر دھول جمائی۔ بچے فوراً رفو چکر ہو گئے۔

کلو نے یونس سے پھسپھسا کر کہا۔ ''پہلے تم جاؤ، سمجھے۔''

یونس کیا کہتا، اسے تو تجربہ حاصل کرنا تھا۔ اس نے ''ہاں'' میں سر ہلا دیا۔

اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پیشانی پر پسینہ چھچھانے لگا تھا۔

ہمت کر کے وہ پلنگ سے اٹھا۔

کلو اس کی جگہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

یونس ہچکچاتے ہچکچاتے جھونپڑی کے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔

وہ ٹینا، ٹپر ٹھونک ٹھانک کر بنایا گیا ایک کام چلاؤ دروازہ تھا۔ اس نے کلو کی طرف دیکھا۔

کلو نے آنکھ کے اشارے سے بتایا کہ دروازہ دھکیل کر وہ گھس جائے۔

یونس نے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔

اندر لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔

وہ اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کونے میں ایک چارپائی ہے اور زمین پر بھی بستر بچھا ہے۔

زمین کے بستر پہ ایک ادھیڑ عورت بیٹھی ہے۔ ٹھیک اس کے خالہ کی عمر کی عورت۔ اس نے صرف لہنگا اور بلاؤز پہن رکھا ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے آئینے کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی ہے۔

یونس کو دیکھ کر اس نے اسے پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

یونس کا دل نفرت سے بھر اٹھا۔

وہ سانولی رنگ کی تھی جو لالٹین کی مدھم روشنی میں کالی نظر آ رہی تھی۔

خاتون نے اسے ایک بار پھر غور سے دیکھا اور ہنسی۔ یونس نے دیکھا کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔

لالٹین کی دھندلی روشنی میں اس کا ہنستا ہوا چہرہ کسی ڈائن کی طرح نظر آیا۔

یونس کو ابکائی آنے لگی۔

ابھی تک اس نے کوٹھا دیکھا تھا تو صرف سنیما میں۔ جہاں طوائف کا کردار نامی گرامی ہیروئین کیا کرتی ہیں۔ ریکھا، مادھوری دکشت، تبو، کرشمہ کپور، روینا وغیرہ ہیروئینیں جب طوائف بنتی ہیں تو کتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک ہیرو ان طوائفوں کے دیوانے ہوتے ہیں۔ ارے، ''منڈی'' فلم میں بھی طوائفیں کتنی خوبصورت تھیں۔

آزاد نگر میں تو سارا حساب ہی الٹا پلٹا ہے۔

خاتون یونس کے پاس آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

اس نے بلاؤز کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔''لیٹ نہیں، جلدی کرو۔ جادا ٹیم نہیں لینا۔''

بلاؤز کے بٹن کھلے اور... یونس کو کاٹو تو خون نہیں۔

وہ اس وقت تک بے حد گھبرا چکا تھا۔

تجربہ کار عورت سمجھ گئی کہ بچہ گھبرا رہا ہے۔ اس نے یونس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

یونس نے اس کے ہاتھ کی سختی محسوس کی۔ وہ ایک کھردرا پتھریلا ہاتھ تھا۔

یونس کی رہی سہی طاقت جواب دے گئی۔

اس نے عورت سے ہاتھ چھڑایا اور اٹھتے ہوئے بس اتنا ہی کہا۔''تھوڑا باہر سے ہو کر آتا ہوں۔''

اور بلا بغیر دیر کیے کمرے سے باہر نکل آیا۔

کلو نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور اشاروں میں پوچھا۔''ہو گیا!''

یونس نے اشارے میں بتایا۔''ہاں!''

پھر کلو اندر گھسا تو یونس فوراً اس آزاد نگری سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

اس کے بعد اس نے کلو کی دوستی بھی چھوڑ دی تھی۔

☆☆

# پانچ

چائے کب ختم ہوئی، وہ جان نہ پایا۔
ایک روپے کی ایک کپ چائے وہ پی چکا تھا اور اسے اس چائے کی تاثیر کا علم بھی نہ ہوا۔
یونس کو سنوبر ''چھیڑی'' کہتی۔
خالو چائے کے دشمن ہیں۔ چائے کو خالو زہر کہا کرتے۔ خالہ چائے کی انتہائی شوقین تھیں۔ خالہ کے گھر کے عجیب حالات تھے۔ خالو جس چیز کے خلاف ہوتے، خالہ اس کام کو دھڑلے سے کرتیں۔ خالو بڑبڑاتے تو خالہ مذمت کرتیں اور ہنستیں۔
یونس کا من اس ایک کپ چائے سے نہ بھرا۔
اس نے ہوٹل والے سے ایک اور کپ چائے کے لیے کہا۔
کیتلی میں چائے بچی تھی۔
خاتون اس کپ میں ڈالنے لگی تو یونس نے اسے ٹوکا۔ ''ٹھنڈا گئی ہوگی۔ تنی گرمالیو۔''
کیتلی کی چائے کو خاتون نے بھٹی پر گرمایا۔
پھر اس کے لیے چائے کپ میں نہ ڈال کر کانچ کے گلاس میں ڈالا۔
یونس نے دیکھا کہ چائے کی مقدار ایک کپ سے زیادہ ہے۔
گلاس دیتے وقت یونس نے محسوس کیا کہ خاتون نے اپنی انگلیوں کو اس سے چھونے دیا ہے۔ وہ مسکرایا۔
اس بار کی چائے نے اسے سیر کیا۔
اس نے سوچا اب سنگرولی اسٹیشن کی سردی اس کا بال بانکا نہیں کرسکتی۔
چائے کے پیسے دینے لگا تو چھٹے واپس کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''کہاں تک

جانا ہے؟''

یونس کیا بتاتا۔ ہر بار تو وہ ایسے ہی نکل پڑتا ہے، بغیر منزل کے بارے میں جانے۔اس بار بھی وہ ایک اندھی چھلانگ لگا رہا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ یہ چھلانگ بغیر بیساکھی کے وہ لگائے گا۔ وہ خود دوڑے گا۔ پھر نشان دیکھ کر کود پڑے گا۔ اب کتنی دور تک اس کی چھلانگ رہے گی یہ تو وقت بتائے گا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ریفری اس کی چھلانگ کو ''فاؤل'' نہ قرار دے دے۔

ریز گاری جیب میں رکھتے ہوئے اس نے عورت کے سوال کا بدیہی جواب دیا۔''کٹنی!''

سچ بھی ہے۔

پہلے تو اسے کٹنی ہی جانا ہے۔

اس کے بعد ہی آگے کی گاڑی پکڑنی ہوگی۔

وہ واپس اسٹیشن لوٹ آیا۔

پلیٹ فارم پر رننگ اسٹاف روم کے باہر جلائی گئی آگ کے پاس ہی اس نے کھڑا ہونا مناسب سمجھا۔

عملے کے لوگ اب بات نہیں رہے تھے۔ لگتا ہے گپ مارتے مارتے وہ تھک گئے ہوں گے۔ اب وہ اونگھ رہے تھے۔ ان کے نیلے اوور کوٹ فرش پر پڑے تھے۔ انہیں نیند پریشان کر رہی تھی۔

یونس ایک پیٹی پر بیٹھ گیا، جس کے سائیڈ میں لکھا تھا۔''اے۔ بی۔ داس، گارڈ۔''

آنچ میں اب جان نہیں تھی۔

نیا کوئلہ ڈالنے پر ہی کچھ آنچ بڑھتی۔

یونس نے سویٹر کے اوپر وینڈ شیٹر پہن رکھا تھا۔

جب گھر سے نکلا تب رات کے نو بجے تھے۔ موسم کافی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

اس کے ہاتھوں اور کانوں میں زیادہ سردی لگتی تھی۔

بینا سے ''اوڑی موڑ'' تک تو وہ بس سے آ گیا۔ پھر اوڑی موڑ میں اسے اگلی گاڑی کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ سنگرولی کے لیے بنارس سے بس آتی ہے۔

اوڑی موڑ اس علاقے کی سب سے ٹھنڈی جگہ ہے۔

اسے بس کا بے صبری سے انتظار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد خالو کی پہنچ سے دور نکل

جائے۔ کہیں ان کا کوئی ساتھی اسے یہاں سفر کرتے ہوئے رنگے ہاتھ پکڑ نہ لے۔

اسی لیے وہ آر۔ ٹی۔ او۔ چیک پوسٹ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں بس رکتی ہے۔

بس آئی تو اسے کچھ راحت ملی۔

یہ اتر پردیش راجیہ پری وہن نیگم کی بس تھی۔

لگتا ہے رابرٹس گنج ڈپو کی بس تھی۔ تبھی تو ایک دم کھڑ کھڑا رہی تھی۔

بس کے اندر سردی سے بچنے کا سوال نہ تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے غائب تھے۔ جن کھڑکیوں میں شیشے تھے بھی تو وہ صحیح سے بند نہ ہوتے۔ پوری بس میں ٹھنڈی ہوا کے تیر چل رہے تھے۔

یونس کے ہاتھ اور کان ٹھنڈے ہونے لگے اور اسے صنوبر کی یاد آ گئی۔

اس نے فوراً اپنے وینڈ شیٹر کے جیب کی تلاشی لی۔

واقعی، صنوبر کے دل میں اس کے لیے ایک کونا محفوظ ہے۔ وہ اپنا فرض بھولی نہ تھی۔ ویںڈ شیٹر کے ایک جیب میں صنوبر کے ہاتھوں سے بنے دستانے تھے، اور دوسرے میں مفلر۔

اس نے داستانے پہنے اور جب مفلر سے کان لپیٹے تو لگا کہ صنوبر غیر مرئی طور پر اس کے ساتھ سفر میں ہے۔

یونس بھاگ رہا تھا۔

وہ بھاگ رہا تھا، بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے اور کھو رہا تھا صنوبر کا ساتھ۔

واقعی صنوبر ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اس نے ہی یونس کے دل میں زندگی کے چیلنج کو قبول کرنے کی خواہش جگائی ہے۔

صنوبر نے ہی اس کی ضمیر کو للکارا تھا کہ یونس، جاگو! دنیا میں کچھ کر دکھانا ہے تو معاشرے میں پہلے اپنی ''کچھ الگ'' پہچان بناؤ!

ورنہ ایک وقت تو وہ اتنا مایوس ہو گیا تھا کہ اسے زندگی سے لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اتنی کم عمر میں اتنی ذلت، اتنے دکھ اٹھانے سے بہتر ہے کہ وہ خودکشی کر لے۔

وہ دوستوں کے درمیان اور کبھی کبھی خالہ کے سامنے اکثر کہتا بھی تھا کہ جی کرتا ہے مر جاؤں تو نجات ملے۔

نجات............

لیکن کس سے؟

زندگی سے یا کہ روزمرہ کے الاہنوں اور طعنوں سے؟

لیکن زندگی اسے صنوبر کی شکل میں اپنے پاس بلاتی - ''تم میرے ہو۔ تمہیں میری خاطر زندہ رہنا ہے۔''

جانے کیسے صنوبر اتنی سنجیدہ باتیں بولنا سیکھ گئی ہے۔

اسکول جاتی ہے نہ!

سہیلیوں کے درمیان اٹھتی بیٹھتی ہے۔

گھر میں ''بلیک اینڈ وائٹ'' ٹی وی ہے۔ اس کا چینل بدل بدل کر ہندی فلموں اور سیریلوں سے یہی سب تو سیکھتے ہیں کالونی کے بچے۔

ایک اور ڈائیلاگ جو یونس کو اچھا لگتا - ''میں تمہارا انتظار کروں گی! تمہیں میری خاطر آنا ہوگا، یونس............''

وہ محمد رفیع کا ایک گانا ہے نہ-

ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے

صنوبر کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔

جب وہ جذبات کے بہاؤ میں ڈوبتی اتراتی رہتی ہو تب آنکھیں نیم باز رہتیں۔

کھوئی کھوئی سی، صفر میں تاکتی آنکھیں۔

صنوبر ابھی درجہ آٹھ کی طالبہ ہی تو ہے۔

چودہ سال کی عمر میں اتنی بڑی بات...

''میری خاطر'' اور ''میں تمہارا انتظار کروں گی!''

عشق محبت میں ڈوبی ہوئی جذباتی باتیں!

صنوبر کئی باتوں میں اپنے خاندان سے کچھ ہٹ کے نظر آتی۔

گوری چٹی صنوبر واقعی اپنے بھائی بہنوں کے بیچ الگ دکھائی دیتی۔ اس کے نین نقش اپنی ماں پر ہیں۔ گولا چہرہ، متوازن ساخت، ماتھا کم چوڑا اور لمبے بال۔

خالو کا سایہ بھی نہیں پڑا ذرا سا۔

اگر اس پر خالو یا ان کے خاندان کے کسی کا سایہ پڑا ہوتا تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی جگہ اندر کی طرف دھنسی گول کٹوریاں ہوتیں۔

پتلے ہونٹوں کی جگہ خالو کی طرح موٹے اور اوپر کی طرف پلٹے ہوئے بے ڈھنگے سے ہونٹ ہوتے۔

صنوبر خالہ خالو کی پہلی اولاد تھی۔

خالو ہندوستانی فوج کی ملازمت پر تھے تب سنوبر کی پیدائش ہوئی تھی۔

فوجیوں کے درمیان گندے مذاق ہوا کرتے۔ اگر فوجی یوپی بہار کا ہے اور اس کے باپ بننے کی خبر آتی تو ہلا ہوتا کہ فلاں نے اپنا لنگوٹ گاؤں بھیج دیا تھا، سو بچہ ہو گیا ہے۔

اگر وہ ان دونوں صوبہ چھوڑ کسی دوسرے صوبے کا ہے تب کہا جاتا کہ فوجی کو ''خط سے بیٹا'' حاصل ہوا ہے۔

یعنی گھر سے خط کے ذریعے خبر آنا کہ فلاں فوجی باپ بن گیا ہے۔

خالو تب راجستھان باڈر پر تھے، جب انہیں خط کے ذریعے اطلاع ملی کہ وہ پہلی اولاد کے باپ بن گئے ہیں۔

لیکن یہ بات خالو بخوبی جانتے تھے کہ صنوبر کی شکل میں ''خط سے بیٹی'' ہی تو ملی ہے۔

یونس کو ان سب سے کیا؟ وہ جانتا تھا کہ صنوبر ایک اچھی لڑکی ہے۔ دیکھنے سننے میں ٹھیک ہے۔ پڑھ لکھ رہی ہے۔ گھر کا کام کاج ٹھیک ٹھاک نمٹا لیتی ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کر لیتی ہے۔ رمضان کے مہینے میں ان خاص دنوں کے علاوہ باقی کے روزے پورے رکھتی ہے۔ نماز کبھی کبھار پڑھ لیتی ہے۔

رشتے میں صنوبر اور یونس بھائی بہن تھے۔

خالہ زاد بھائی بہن!

یونس یہ بھی جانتا تھا کہ اسلامی معاشرے میں یہ رشتہ محبت یا شادی کے لیے رکاوٹ نہیں!

☆☆

## چھ

یونس نے اپنی اماں کے منھ سے خالہ کے بارے میں کئی باتیں سنی ہیں۔

خالہ تب تیرہ برس کی تھیں، جب ان کی شادی ہوئی تھی۔

یونس کی اماں خالہ سے دو تین سال بڑی تھیں۔

یونس کا ننہال انتہائی غربت میں اپنے دن کاٹا کرتا تھا۔ بے حد تکلیفوں اور سہولتوں کی شدید عدم دستیابی کے درمیان خالہ اور اماں پلی بڑھیں۔

ان کے والد بنیادی طور پر چرواہے تھے۔

اپنے گاؤں اور آس پاس کے ایک دو گاؤں والوں کی بکریاں چراتے تھے۔

یونس کے نانا کا نام تھا ظہور میاں۔

پتلا دبلا جسم، ہاتھ پیر کسی درخت کی ٹہنی جیسے ٹیڑھے مینڈھے، پچکے گالوں پر جھریاں، ٹھوڑی پر تھوڑے سے کالے سفید بال، مونچھیں صفا چٹ، اور گنجے سر پر لپیٹا گیا گونچھا۔ وہ گونچھا ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا۔ بدن پر وہ ایک لٹھے کے کپڑے کی بنیان اور نیچے چوخانے والا تہمد پہنتے۔ ظہور میاں کے کپڑے ہفتے میں دو بار دھلتے۔

خالہ کا نام سکینہ تھا۔

یونس کی اماں کا نام آمنہ۔

اماں کہتی ہیں کہ خالہ بچپن سے ہی بڑی جھگڑالو تھیں۔ وہ گاؤں کے لڑکوں کو پیٹ دیا کرتی تھیں۔ لڑکے ان سے سیدھے لڑنے سے گھبراتے۔ بولتے، یہ سکینہ مسلی بڑی بدمعاش ہے۔ اس سے نمٹنا ہو تو اس پر چوری سے وار کرو۔ لڑکے منصوبے بناتے رہ جاتے اور اکثر پٹ جاتے۔

ایسی شریر لڑکی تھیں خالہ۔

شلوار کرتا سال میں ایک بار بنتا، عید کے موقع پہ۔ ایک جوڑا کپڑا پچھلے سال کا اور ایک نئے سال کا۔ بس یہی دو جوڑے کپڑے ہوا کرتے تھے۔ ہاں، دو بہنوں کے نئے پرانے کپڑوں کو اگر ایک کر دیا جائے تو اس طرح چار جوڑے کپڑے ہوتے تھے۔ نہانے دھونے کے لیے ابا کا تہمد بدن پر لپیٹنے کے کام آجاتا۔

گاؤں میں تین کنوئیں تھے۔ ایک تو برہمنوں کا تھا۔ ایک پٹیلوں کا اور تیسرے کنوئیں کا پانی مسلمان اور چھوٹی ذات کے لوگ استعمال کرتے۔ پھر پرائمری اسکول کے صحن میں ایک ہینڈ پمپ بھی لگ گیا تھا۔

پینے کا پانی کنویں سے آتا اور نہانے دھونے کے لیے وہ گاؤں کے باہر سے بہنے والی پہاڑی ندی میں جایا کرتے تھے۔ جہاں آرام سے خالہ اور اماں اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتیں۔

یونس کی نانی بیمار رہا کرتیں۔ انہیں خون کی الٹیاں ہوتیں۔ گاؤں میں ٹی بی جیسی بیماری کا نام لوگ منھ پر نہ لاتے۔ بھوت، جن، چڑیل کا غضب ہی ساری بیماریوں کی وجہ ہوا کرتا۔ ہوشیار لوگ ہر مصیبت کا حل گنڈے تعویز، تنتر منتر کے ذریعے کرتے۔ گاؤں میں جگہ جگہ دیوتاؤں کے چبوترے بنے تھے۔

ابا ظہور میاں جڑی بوٹیوں کے خود ساختہ ماہر تھے۔ جنگل میں بکریاں چراتے چراتے انہیں نہ جانے کتنی جڑی بوٹیوں کی معلومات ہوگئی تھی۔ وہ سانپ بچھو کاٹنے کا منتر بھی جانتے تھے۔ اپنی بیوی کے علاج کے لیے وہ عجیب وغریب جڑیاں گھر لاتے۔ انہیں خود کوٹتے چھانتے۔ ان کا عرق نکالتے اور بیوی کا علاج کرتے۔

جمعہ کی نماز پڑھنے قصبے جاتے تو بڑے حافظ جی سے منتیں کر کے بیوی کے لیے تعویز لے آتے۔ ان سب ٹونوں ٹوٹکوں کی وجہ سے یا پھر ضعیفی کی وجہ سے ماں کی طبیعت کبھی نرم ہوتی تو کبھی گرم۔ وہ بے وقت مر گئیں۔

کہنے کو تو ماں نے پانچ بچے پیدا کیے، لیکن بچے صرف تین ہی۔

یونس کی اماں بتاتی -''اماں زیادہ دن نہیں زندہ رہیں۔ نہیں تو ہم لوگ ایسے یتیم نہ

ہوتے۔''

یونس کا واحد ماما گنجیڑی شرابی نکل گیا۔

اپنے آنگن میں گانجے کا پیڑ لگانے کے جرم میں جیل بھی کاٹ آئے ہیں۔ انہوں نے با قاعدہ شادی بیاہ کیا نہیں۔ گاؤں کی ایک 'کیوٹن' کو ساتھ رکھے ہیں، اس لیے ان سے بہنوں نے رشتہ توڑ لیا ہے۔ ذات برادری سے انہیں 'بائی کاٹ' کر دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کیوٹن کے پہلے مرد سے ہوئے بچوں کو وہی پالتے ہیں۔ ان کے گھر میں مسلمانوں کا کوئی تیج تہوار نہیں منایا جاتا۔ ہاں، دیوالی، ہولی، کھجلیاں، رام نومی وغیرہ تہوار منائے جاتے ہیں۔

یونس کے نانا ظہور میاں کے مرنے کے بعد یونس کی اماں اور خالہ ایک بار ان کے چہلم کے موقعے پر گاؤں گئی تھیں۔

تب ماما اور اس کیوٹن مامی نے ان کی خدمت تو دور یونس کے ابا اور خالو کی بھی کوئی خیر خیریت نہ لی۔ خالو ویسے بھی بدمزاج فطرت کے شخص ٹھہرے۔ ملٹری کے فوجی۔ اتنا ناراض ہوئے کہ خالہ کو طلاق دینے کی دھمکی تک دے ڈالی۔ وہ تو ابا کے ایک دوست بغل کے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ مل گئے اور خالو کو ابا وہیں لے گئے۔ تب جا کر کہیں ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تھا۔ پھر بھی انہوں نے جیتے جی اس گلی میں دوبارہ قدم نہ رکھنے کی قسم کھا ہی لی تھی۔ کسی طرح چہلم کا فاتحہ کرا کے وہ لوگ جو وہاں سے واپس آئے تو پھر دوبارہ اُدھر کا رخ نہ کیا۔

ماما مرے چاہے چولہے میں جائے۔

یونس کی اماں کی شادی 'کوتما' میں ہوئی۔ یونس کے ابا تب گھوم گھوم کر اخبار بیچا کرتے تھے۔ ظہور میاں کو بڑے حافظ جی نے اس رشتے کے بارے میں خبر کی تھی۔ بتایا تھا کہ لڑکا یتیم ضرور ہے لیکن پڑھا لکھا ہے۔ اس میں کوئی عیب نہیں۔ نہ کہو، کبھی بیڑی پی لیتا ہے۔ ہاں، خددار بہت ہے۔ خود کماتا ہے۔ وہیں مدرسے میں پلا بڑھا ہے۔

پھر بڑے حافظ جی نے مشورہ دیا۔ ''تم کہو تو وہاں کے امام سے اس رشتے کے لیے بات کروں۔ اللہ چاہے گا تو بات بن بھی سکتی ہے۔''

نانا نے حامی بھر دی۔

اور اس طرح بات پکی ہوئی اور پھر ان کا نکاح بھی ہو گیا۔

شادی کے بعد مرد کی قسمت بدلتی ہے۔
یہ بات ابا پر بھی ثابت ہوئی۔
انہیں سینچائی محکمہ میں عارضی طور پر چپراسی کی ملازمت ملی۔
ان میں پڑھنے کی لگن تو تھی ہی۔
پرائیویٹ طور پر ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھے۔
اس سال امتحان کے مرکز پر جم کے نقل ہوئی۔
ابا پاس ہوگئے اور اس پڑھائی کی بدولت وہیں ترقی پاکر بابو بن گئے۔
''ڈسپیچ کلرک۔''
ٹھیکیدار کے منشی وغیرہ آتے اور خط و کتابت حاصل کرنے کے لیے خرچا پانی دیا کرتے۔
اس سے تھوڑی بہت اوپر کی آمدنی بھی ہو جاتی تھی۔
راجیہ سرکار کی ملازمت میں ویسے بھی تنخواہ بہت کم تھی۔
کہتے ہیں کہ اماں کی شادی کے بعد خالہ بھی ابا ظہور میاں کو اکیلا چھوڑ کر کوتما اپنی بڑی بہن کی سسرال آگئیں۔
شاید اسی لیے ابا موڈ میں رہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''ایک ٹھوسالی کے علاوہ مجھے جہیز میں کہاں کچھ ملا۔ ٹھگ لیا سسرے نے۔''
یونس نے اپنی اماں کے منھ سے سنا کہ خالہ پکارا کرتیں اور اللہ سے دعا مانگتی کہ اللہ میاں، یا تو ہمیں اپنے پاس بلالو یا پھر ہمارا نکاح کروادو۔
ابا اور اماں کی کوششوں سے قریب کے گاؤں کی بیوہ کے اکلوتے بیٹے سے خالہ کا نکاح ہوا۔
خالو فوج میں نوکری کرتے تھے۔
خالو کی اندھی، بوڑھی، بیوہ ماں کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا لخت جگر، نور نظر، بیٹا فوج میں بھرتی ہوکر جان خطرے میں ڈالے۔
اسی لیے خالو نے اپنی ماں سے چوری چھپے بھرتی مہم میں حصہ لیا۔
قد کاٹھی تو ٹھیک تھی ہی۔

گاؤں کا کھیلا کھایا جسم۔
ان کو منتخب کر لیا گیا تھا۔
وہ جانتے تھے کہ ماں راضی نہ ہوں گی، اس لیے ان کو بغیر بتائے نوکری جوائن کر لی۔
جب ٹریننگ کے لیے بلاوا آیا تو ماں کو پتہ چلا۔
بیٹے کی ضد کے آگے ماں جھکی۔
بوڑھی بیوہ ماں نے بیٹے کو گھر سے باندھنے کے لیے ایک طریقہ سوچا۔ لگی اپنے چاند سے بیٹے کے لیے کوئی حور پری سی بہو ڈھونڈنے۔
اِدھر اُدھر بات چلائی۔
پھر ظہور میاں کی بیٹی کے بارے میں یونس کے ابا سے خبر ملی تو اس طرح ان کی دل کی مراد پوری ہوئی۔
سوچا کہ غریب گھر کی لڑکی ہے۔ دکھاوا نہ کرے گی اور بیٹے کی گرہستی کی گاڑی کو ڈھنگ سے کھینچ لے جائے گی۔
اس لیے انہوں نے حامی بھر دی۔
خالہ کی عمر اس وقت چودہ سال کی رہی ہوگی اور خالو کی چوبیس پچیس۔
ویسے قاعدے سے دیکھا جائے تو جوڑی بے میل تھی۔
لیکن گاؤں گراوں کی لڑکیاں چھوٹی عمر ہی میں ازدواجی زندگی کی باریکیاں جان سمجھ جاتی ہیں۔
ارہر کے کھیت، ندی نالے کے گھاٹ، پنگھٹ، پگڈنڈی وغیرہ میں وہ جنسی اعمال کے باطنی سبق سیکھ جاتی ہیں۔
بکریاں چراتے چراتے خالہ بھی کچھ زیادہ ہی پاگل ہو چکی تھیں۔
کہتے ہیں کہ ان کے کئی عاشق تھے۔
وہ بہت ہوشیار تھیں۔
لائن سب کو دیتی تھیں، لیکن ایک حد تک... بس!
ہاں، ممدو پہلوان کی جیت کے آگے ان کی ایک نہ چلتی، خالہ اس طرح پگھلتی، جیسے

آگ کے آگے برف۔

شادی کے بعد خالو کچھ دن تک گاؤں میں رہے۔

خالہ کے اس وقت دن دسہرہ اور رات دیوالی ہوا کرتی تھی۔

پھر جیسے ہی چھٹیاں ختم ہوئی، خالہ کی آنکھوں میں آنسو دے کر خالو فوج میں واپس لوٹ گئے۔انہوں نے سہاگ رات میں خالہ سے کئی وعدے کروائے۔

جیسے کہ ان کی بیوہ ماں کی دیکھ بھال کے لیے انہوں نے شادی کی ہے، اس لیے ان کی دیکھ بھال میں کوئی کمی نہ ہو۔

جیسے کہ وہ گھر میں اکیلے ہیں گاؤں میں تمام کھیتی کے لائق زمین ہے، اسے استعمال کے قابل بنایا جائے تاکہ فوج سے ریٹائرمنٹ لے کر جب وہ لوٹیں، تب آرام سے کھیتی کسانی کر کے دن گزارے جائیں گے۔

جیسے کہ خالو کو اپنی اور گھر کی عزت سے بہت محبت ہے، خالہ سے ایسا کوئی قدم نہ اٹھے، جس سے اس گھر کی عزت پر آنچ آئے۔

خالہ محبت کے جھولے میں جھولتی ہر بات پر ''ہاں'' کہہ دیتیں۔

انہیں کیا معلوم تھا کہ وعدہ کرنا آسان ہے اور اسے نبھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

خالو کے فوج میں واپس جاتے ہی ان کا من سسرال میں نہ لگا۔

بوڑھی اندھی ساس بڑی حجت کرتی۔

بات بات پر ٹوکتی۔

ویسے بھی خالہ ایک آزاد پنچھی کی طرح اپنے میکے میں پلی بڑھی تھیں۔ان کو کسی کی روک یا لگام کہاں برداشت ہوتی۔

ساس کی کل، کل سے تنگ آکر ایک دن وہ اپنے میکے چلی گئیں۔

خالو کی غیر موجودگی میں ان کے زیادہ تر دن میکے میں ہی گزرے۔شادی ہو جانے کے بعد ممدو پہلوان سے ان کا عشق اب بے دھڑک چل نکلا۔ان کی محبت کی گاڑی پٹری یا بغیر پٹری کے بھی دھکادھک دوڑنے لگی۔

☆☆

# سات

خالو جب تک باہر رہتے، خالہ زیادہ تر اپنے میکے میں رہتی تھیں۔

خالو کے گاؤں میں پینے کے پانی کی تکلیف تھی۔ نستار کے لیے تو گاؤں کے باہر تالاب میں لوگ پہنچتے تھے۔ گاؤں کے بڑے 'گرہست پٹیل' کے گھر ایک کنواں تھا۔ اس میں سال بھر پانی رہتا۔ خالو کی فوج کی کمائی سے خالو کی بوڑھی ماں نے ایک کنواں کھدوایا تھا جس میں جیٹھ کا مہینہ چھوڑ کر سال بھر پانی رہتا تھا۔ بڑھیا نے سوچا تھا کہ بہو آئے گی تو اسے آرام رہے گا۔

لیکن بہو کو کہاں تھی ساس کی فکر۔

وہ تو صرف اپنے مفاد کے لیے زندہ تھی۔

خالو چھٹیوں پر آتے تو ایک دو دن گاؤں میں رہتے، پھر ان کا من اچٹ جاتا۔ فوج میں خاندان کی کمی تو کھلتی ہے، ورنہ فوج جیسی خوشی اور کہاں؟

خالو کسی نہ کسی بہانے بوڑھی ماں کو منا کر اپنی سسرال چلے جاتے۔ وہاں جا کر خالہ کے پیار میں ایسا بندھتے کہ پھر انہیں دین دنیا کا ہوش نہ رہتا۔ وہ یہ بھی بھول جاتے کہ انہیں فوج میں واپس بھی جانا ہے۔

خالہ کے ریشمی روپ کا جادو اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دینے کی پہلی خالو کہاں سمجھ سکتے تھے۔ قحط سے دوچار آدمی بھوک کی شدت میں کہاں طے کر پاتا ہے کہ دیا گیا کھانا جھوٹا ہے یا باسی۔ وہ تو تابڑ توڑ پیٹ کی آگ بجھانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

خالو کی بوڑھی ماں اسی غم میں بے وقت مر گئی کہ اس رنڈی، چھنال بہو نے اس کے بیٹے پر جانے کیسا جادو کر دیا ہے۔ اس کے اکلوتے بیٹے پر اس جادوگرنی نے ایسا جادو کیا کہ وہ اپنی بوڑھی ماں کو ایک دم بھول گیا۔

صنوبر کی پیدائش اس کے ننہال میں ہوئی۔

کئی دن بعد بوڑھی ساس کو اطلاع ملی کہ وہ دادی بن گئی ہیں۔

ان کی بہو نے ایک لڑکی پیدا کی ہے۔ یہ خبر پا کر بڑھیا نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

پھر بھی دنیا میں اپنی عزت کا لحاظ کر کے رشتے کے ایک بھتیجے کو ساتھ لے کر وہ بہو کے میکے گئیں۔

خالہ چھٹی نہا چکی تھیں۔

وہ آنگن میں پلنگ پر بیٹھی صنوبر کے بدن کی مالش کر رہی تھیں۔

بڑھیا ساس کو دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔

پھر بھی انہوں نے سلام کیا اور دونوں کو پیرا سے بنے موڑھے پر بٹھایا۔

گھر میں ان کے بھائی نہ تھے۔ کیوٹن بھابھی ہی تھی۔

خالہ نے انہیں آواز لگائی۔

خالو کی بڑھیا ماں نے انہیں کسی کو بلانے سے منع کر دیا۔

ویسے بھی اس گھر میں وہ کھانا پانی نہیں پی سکتی تھیں کیونکہ خالہ کے بھائی نے ایک کجات کو اپنی بیوی بنا کر رکھا ہے۔

بس انہوں نے اتنا ہی کہا کہ ایک بار نوزائیدہ بچی کو پیار کریں گی اور پھر چلی جائیں گی۔ ہاں، اگر یہاں کوئی تکلیف ہو تو بہو بھی چاہے تو ساتھ چل سکتی ہے۔

صنوبر اپنی دادی کی گود میں آ کر کھیلنے لگی۔

دادی نے اپنے بھتیجے سے پوچھا۔"کس پر گئی ہے بچی؟"

بھتیجا کیسے فیصلہ کرتا کہ بچی کس پر گئی ہے۔

اسے تو بچی صرف روئی کا گولا نظر آ رہی تھی۔

ہاں، پھر بھی وہ اس بچی کے چہرے کی کچھ خصوصیات بڑھیا کو بتانے لگا۔

تبھی گھر میں ممدو پہلوان آ گیا۔

بھتیجے نے جو ممدو پہلوان کو دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ جیسے بچی کے چہرے کی ساخت کہیں اس پہلوان سے تو نہیں ملتی ہے؟

بھتیجا ابھی نادان تھا۔

اس نے ایسے ہی کہہ دیا کہ ان چچا جیسی تو نظر آتی ہے یہ لڑکی۔

خالہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

ممدو پہلوان کے تو جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

بھتیجے کو کیا پتہ تھا کہ اس نے کیا کہہ دیا؟

بس، پھر کیا تھا۔ بڑھیا ساس نے اپنے اندھے پن کو کوسا اور بھتیجے سے کہا کہ فوراً واپس چلے۔

انہوں نے وہیں اپنی بہو کو خوب کھری کھوٹی سنائی۔

بیٹے کو ساری بات بتانے کا ارادہ کیا۔

وہ اتنا ناراض نہ ہوتیں اگر ان کی چھنال بہو نے پوتا پیدا کیا ہوتا یا اس نوزائیدہ بچے کے نین نقش ددیہال یا ننہال کسی پر ہوتے۔

بڑھیا ماں ہمیشہ طعنہ دیا کرتیں کہ اس کے بیٹے کے ساتھ اس ڈائن بہو نے فریب کیا ہے۔ وہ بدچلن ہے۔ وہ بیوہ بے چاری کیا کرے، اس ڈائن نے تو ان کے بیٹے پر جادو کیا ہوا ہے۔اس کے گبرو جوان بیٹے کو نظر بند کر کے رکھا ہوا ہے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ خالو کو اتنی اولادوں کا باپ کہلانے کا اعزاز خالہ ہی نے تو دستیاب کرایا ہے۔

اسی بات پر وہ اپنی ساس کو تشدد کا نشانہ بنایا کرتی -''اگر تمہارے بیٹوا جیسے نااہل فوجی کے بھروسے رہتی تو اس خاندان میں اینٹ پتھر ابھی نہ ہوا ہوتا۔ پھر دیکھتے کیسے چلتی تیری نسل!''

فوج کا کھایا پیا جسم خالہ کے آگے بونا ہو جاتا۔

نتیجتاً خالو جس بچے کو سامنے پاتے، پیٹ ڈالتے۔

یونس سب جانتا سمجھتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دودھ دینے والی گائے کی لات بھی پیاری ہوتی ہے۔ خالہ جو خالو کی چوری اور کبھی سینہ جوری میں اپنے غریب خاندان والوں کی مالی مدد کرتی ہیں، اس کے آگے لوگ ان کے گناہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اسی طرح خالہ سب کی کوئی نہ کوئی مجبوری جانتی۔ ان سے متعلق تمام لوگ ان کے

احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔

خالو کو خالہ ایک پالتو جانور بنا کر رکھتیں۔

خالو جب کبھی غصہ ہوتے تو بچوں کو مارتے پیٹتے۔ کھانے کی پلیٹ پٹکتے۔ غصے میں خالو گھر سے نکل جاتے۔ لیکن ان کا غصہ زیادہ دیر تک ٹکتا نہیں۔ جلد ہی وہ خالہ کی للو چپو کرنے لگتے۔

## آٹھ

ایسی بات نہیں ہے کہ خالو کی بوڑھی ماں کلکل ہن تھی یا کہ خالہ پر کوئی جھوٹا الزام لگایا گیا تھا۔

یونس کو بھی خالہ کا غیر ضروری طور پر چنچل پن پسند نہ آتا۔ اسے لگتا کہ ایک عمر کے بعد انسان کو سنجیدہ ہو جانا چاہیے۔

خالہ جب غیر مردوں سے ٹھٹھولیاں کرتیں تو یونس کا دماغ خراب ہو جاتا۔

یونس اکثر خالہ کے معمول کے بارے میں سوچا کرتا۔ خالہ زمانے سے بے فکر صرف اپنی ہی دھن میں لگی رہتیں۔ لگتا کہ انہیں کسی قسم کی کوئی فکر ہی نہ ہو۔ صرف اپنے لیے ہی جینا...

صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے خالہ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوتیں۔

ہونٹ پر بہہ آئے تھوک اور آنکھ کی کیچڑ کو گوبچھے کے کونے سے صاف کرتیں۔

اپنے بکھرے بالوں کو سنوارتیں۔

چہرے کو کئی طرح سے دیکھتیں۔

پھر آنگن میں جا کر ٹینکی کے پانی سے کلی کرتیں اور چہرے پر پانی سے چھینٹے مار کر تولیے سے رگڑ کر چہرہ صاف کرتیں۔

اس کے بعد ٹوتھ برش میں ڈھیر سارا پیسٹ لگا کر باہر صحن میں آ جاتیں۔ ٹوتھ پیسٹ خالو ملیٹری کینٹین سے لایا کرتے تھے۔

باہر دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اڑوس پڑوس کی جھاڑو بہارتی عورتوں سے گپ کا پہلا دور چلاتیں۔ جس میں بیتی رات کے من گھڑنت تجربات پر دانت نپورا جاتا۔ پیسٹ سے نکلے جھاگ کیاری میں تھوکتے ہوئے خالہ تیز آواز میں ہنسیں۔

خالہ کا سینہ اور کولہا بھاری ہے۔
بغیر اندورونی کپڑوں کے میکسی کے لبادے میں ان کے جسم کے نشیب وفراز واضح طور سے دکھائی دیتے تھے۔
خالہ کا میکسی پہننا یونس کو پھوٹی آنکھ نہ بھاتا۔ ویسے بھی ان کا جسم کسی ڈھول کے سائز کا تھا۔ ایسے جسم پر شلوار کرتہ یا پھر ساڑی ٹھیک رہتی۔ میکسی ویسے تو تن ڈھاپنے کا کپڑا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ اسے رات میں سوتے وقت پہنا جائے یا پھر گھر کے کام کاج کرتے ہوئے جسم پر ڈال لے انسان۔ کسی پرائے مرد کے سامنے یا پھر گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں انسان کو بہتر کپڑے پہننے چاہئے۔ یا پھر میکسی ضروری ہی ہو تو کسی کے سامنے آنے سے پہلے سکارف ڈال لینا چاہئے۔
صنوبر کو بھی اپنی امی کا یہ جوڑا پسند نہ آتا۔ وہ اکثر ان کو ٹوکا کرتی کہ امی میکسی پہن کر باہر نہ نکلا کرو۔ میکسی تو بیڈروم کا لباس ہوتا ہے۔
لیکن خالہ کسی کا صحیح مشورہ مان لیں تو پھر خالہ کس بات کی!
منھ دھونے کے بعد خالہ رسوئی کی طرف جاتیں، جہاں سنوبر کے ساتھ ناشتہ بنانے لگتیں۔
ناشتہ واسطہ کے بعد صنوبر برتن دھونے بھڑ جاتی اور خالہ ٹینکی کے پاس ٹب بھر کپڑے لے کر بیٹھ جاتیں۔ کپڑے دھونے کے بعد وہ وہیں نہانے لگتیں۔ خالہ باتھ روم میں کبھی نہیں نہایا کرتیں تھی۔
نہا دھو کر خالہ بیڈروم میں آجاتیں۔ پھر سنگھار کی میز اور الماری کے درمیان ان کا ایک گھنٹہ گزر جاتا۔
اس درمیان صنوبر برتن دھو کر نہا لیتی اور اسکول جانے کی تیاری کرنے لگتی۔
تبھی خالہ کی آواز گونجتی ’’ارے حرامی، ہیٹر پر دال چڑھائی ہے یا ایسے ہی اسکول بھاگ جائے گی؟‘‘
صنوبر اسکول کا ڈریس پہنے بڑبڑاتی ہوئی رسوئی میں گھستی اور کوکر میں دال پکنے کے لیے چڑھا دیتی۔
کوکر پرانا ہو چکا ہے، اس کا پریشر مناسب طریقے سے بنتا نہیں، اس وجہ سے اس میں

دال پکنے میں وقت لگتا ہے۔

سبھی بچے اسکول چلے جاتے اور خالہ بن ٹھن کر باہر نکل آتیں۔

تب تک ایک دو پڑوسن بھی خالی ہو جاتیں۔

پھر ان میں گپ بازی شروع ہوتی تو وقت جیسے ٹھہر جاتا۔

ایک دو بجے ہاف ٹائم پر گھر آتے تو بھی خالہ ٹس سے مس نہ ہوتیں۔ بچے خود کھانے کا سامان تلاش کر کے کھا لیتے۔

دو پہر کے ایک بجے کے آس پاس عورتوں کا اجلاس ختم ہوتا۔

گھر آ کر خالہ چاول کے لیے پانی چڑھاتیں اور جلدی جلدی چاول چننے بیٹھ جاتیں۔

چاول پکا کر فرصت پاتیں، تب تک چیٹے پوٹے اسکول سے واپس آنے لگتے۔ دوو پہر کے کھانے میں سبزی کبھی بنی تو ٹھیک ورنہ اچار کے ساتھ دال چاول کھانا پڑتا۔ دیہاتی ٹماٹر کے دنوں میں صنوبر جب اسکول سے لوٹتی تو خالو کے لیے ٹماٹر کی چٹنی سِل پر پیستی تھی۔

دو پہر کا کھانا کھا کر خالہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو جاتیں۔

شام کو نیند کھلتی تو پھر وہی آئینے کے سامنے والا منظر دہراتیں۔

پھر فریش ہو کر ساڑی بلاؤز پہنتیں۔ ساڑی پہننے کا ان کا سلیقہ کسی افسرائن کی طرح کا ہوتا۔ چہرے کو پاؤڈر، لپ سٹک، کاجل سے سجاتیں۔

تب تک انہی کی طرح ان کی کوئی سہیلی آجاتی اور اس کے ساتھ مارکیٹ نکل جاتیں۔ سبزیاں یا دیگر چیزیں وہ خود خرید کر لایا کرتیں تھیں۔

خالو تو گیہوں پسوانے اور چاول دال لانے جیسے بھاری کام کرتے۔

سات آٹھ بجے تک خالہ لوٹتیں۔

پھر صنوبر کے ساتھ بیٹھ کر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ جاتیں۔

اس درمیان کوئی ملنے والا یا والی آجائے تو پھر پوچھنا ہی کیا؟

بچے پڑھیں یا پھر اُدھم بازی کریں، خالہ پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

انہیں تو کوئی حامی بھرنے والا مل جائے تو آن طعن کی ہانکتی رہیں گی۔

صنوبر اسی لیے بڑبڑایا کرتی کہ امی کی وجہ سے گھر میں اتنا ہلا غلہ مچا رہتا ہے کہ پڑھائی

میں دل نہیں لگ پاتا۔ گپے ہانکنے کے لیے خالہ گھر آئے لوگوں کو چائے نمکین بھی کرایا کرتیں۔ جس کے لیے صنوبر کو پریشان ہونا پڑتا۔

ایسے گھر میں نظم وضبط کا تصور بھی بیکار تھا۔

☆☆

# نو

یونس یاد کرنے لگا اپنی زندگی کا وہ منحوس دن، جب جمال صاحب اس کی زندگی میں آئے اور ایک یقینی سمت میں آگے بڑھ رہی اس کی زندگی کی گاڑی پٹری سے اتر گئی............

اسے اچھی طرح یاد ہے وہ جمعہ کا دن تھا، کیونکہ اس دن گھر میں گوشت پلاؤ پکا تھا۔ ہوتا یہ کہ جمعہ کی نماز ادا کر کے گھر آنے پر سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ یونس نماز کے بعد پڑھے جانے والے صلاۃ وسلام میں شامل نہ ہوتا۔ اس میں اتنا صبر کہاں ہوتا۔ وہ فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے سب سے پہلے بھاگنے والوں میں شامل رہتا۔ ویسے بھی وہ بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

گرمی کی وجہ سے اسے گوشت پلاؤ کے ساتھ پیاز کھانے کا من ہوا۔ اس لیے گھر آ کر یونس نے سب سے پہلے سبزی کی ٹوکری سے ایک پیاز اٹھائی۔ پھر اسے کاٹنے کے لیے چھری تلاش کرنے باورچی خانے میں جا گھسا۔

صنوبر اسکول ڈریس پہنے ہوئے باورچی خانے میں اکڑوں بیٹھ کر چپڑ چپڑ گوشت پلاؤ کھا رہی تھی۔ یونس کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور اپنی پلیٹ سے گوشت کی ایک بوٹی اٹھا کر یونس کی جانب بڑھائی۔ یونس نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شرارت اور محبت کے ملے جلے تاثرات دیکھے۔

یونس نے بوٹی منھ کے حوالے کی۔

ایک دم رس گلہ کی طرح منھ میں پگھل گیا تھا گوشت... واقعی رحمت چیکوا خالو کے نام پہ اچھا گوشت دیتا ہے۔

صنوبر نے یونس کے ہاتھ میں پیاز دیکھ کر اس سے پیاز مانگ لی۔

کھانا ختم کر کے پلیٹ میں ہی ہاتھ دھو کر سنوبر ایک تشتری میں پیاز کاٹنے لگی۔ پیاز کے پتلے پتلے گول ٹکڑے۔

تبھی خالہ رسوئی کی طرف آئیں۔

یونس کے منہ کو چلتا دیکھ انہوں نے پوچھا۔''گوشت کیسا بنا ہے؟''

یونس نے رحمت چیکوا کی بڑائی کرتے ہوئے کہا۔''ایک نمبر کا مال ہے خالہ! رحمتو اخالو کے نام پر مال ٹھیک دیتا ہے۔''

واقعی پیسے بھی دو اور مال بھی ٹھیک نہ ملے، کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ کوکر میں گلاتے گلاتے مر جاؤ۔ گوشت بھی اتنا بدبودار نکل آئے کہ گھن آجائے۔ آدمی گوشت کھانے سے توبہ کر لے۔

خالہ نے کہا۔''اللہ کا فضل ہے کہ رحمتو اچھا گوشت دیتا ہے۔''

عموماً جمعہ اور اتوار کے دن رحمت چیکوا کی دکان سے تین پاؤ گوشت منگوایا جاتا۔ یونس ہی گوشت لینے جاتا۔ کالونی کے باہر ریلوے لائن کے اس پار نالے کے ایک طرف قصائیوں کی دکانیں روزانہ سجتیں۔ ریلوے کی زمین پر غیر قانونی طور پر قبضہ کر کے چیکوا لوگوں نے اپنے گھر اور دکانیں بنالی تھیں۔ کہتے ہیں کہ آر۔ پی۔ ایف۔ والے آکر وصولی کر جاتے ہیں۔ ریلوے والوں سے ملی بھگت ہے سب۔

اس غیر اعلانیہ محلے کو قصائی ٹولا کہا جاتا۔

رحمت چیکوا خالو کے گاؤں کا تھا، لہٰذا اسی روپے کلو کا مال ان کے گھر ساٹھ روپے کے حساب سے آتا۔

یونس کبھی سوچتا کہ اتنے کام سیکھے اس نے لیکن قصائی کا کام نہ سیکھا۔ ویسے گھر میں عید بقر عید کے موقع پر ہونے والی قربانی میں باہر سے قصائی نہ بلوایا جاتا۔ ابو اور سلیم بھیا بکرے کو ذبح کر کے کھال پوشی کر لیتے تو یونس بوٹیاں بنالیتا تھا۔ اصل فن کاری تو کھال صحیح سلامت بکرے کے جسم سے الگ کرنے میں ہے۔ اس کھال کو مقامی مدرسے میں بھیجا جاتا۔ جس کی نیلامی ہوتی اور جو پیسے ملتے وہ مدرسے کی آمدنی ہو جاتی۔

گوشت لینے خالہ یونس کو صبح سات بجے دوڑا دیتیں۔ کہتیں کہ چیکوا سسرے صبح ٹھیک مال دیئے تو ٹھیک ورنہ بعد میں دو نمبر یا مال ملتا ہے۔

سات بجے رحمت اپنی دکان سجا نہیں پاتا تھا۔ اس لیے یونس سیدھے اس کے گھر چلا جاتا۔ گھر کے باہر ہی تو گوشت کی دکان تھی۔

رحمت چیکوا کی ایک بیٹی تھی۔ سانولی سی شرارتی لڑکی۔ نین نقش تیکھے۔ سانولی رنگت۔ یونس کو دیکھ کر جانے کیوں وہ مسکراتی۔

رحمت کی بیوی اسے ''بانو'' کہہ کر پکارتی۔ وہ دیہاتی زبان میں باتیں کرتی۔

اس میں ایک ہی عیب تھا۔ اس کے پیلے مٹ میلے ٹیڑھے مینڈھے دانت۔ جب وہ ہنستی یا کچھ بولتی تو اس کے دانت باہر نکل آتے اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔

وہ جب بھی رحمت کے گھر جاتا، وہاں کانس کی چاردیواری کے اندر بکریوں کی ممیاہٹ گونج رہی ہوتی اور ''بانو'' آنگن میں جھاڑو لگاتے ملتی۔

جب وہ جھکتی تو کرتے کے گلے سے اس کے ابھار چھلک آتے۔ یونس کو یقین ہے کہ ''بانو'' جان بوجھ کر اسے یہ انوکھا سکھ دینا چاہتی تھی۔

پھر رحمت کے لیے چائے یا پانی لے کر آتی تو یونس بھی اس میں شامل ہو جاتا۔

چائے کا کپ یا گلاس پکڑاتے وقت وہ آسانی سے اپنے ہاتھوں کا رابطہ اس کے ہاتھ سے ہونے دیتی۔ کپ کو پکڑے ہوئے وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہتا۔ بس، یہیں گڑبڑ ہو جاتی۔ آنکھیں ملتے ہی ''بانو'' مسکراتی۔ اس کے ہونٹ پلٹ جاتے اور کھپریل سے مٹ میلے دانت باہر نکل آتے۔ خوبصورتی کا طلسم ٹوٹ جاتا۔ یونس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے رحمت کی دکان کے کونے میں پڑے، بکروں کے کٹے سر دیکھے ہوں، جن کے دانت اسی طرح باہر نکلے رہتے ہیں۔

رحمت چیکوا خصی کے نام پر کیسا بھی گوشت کاٹ کر فروخت کرنے کے لیے بدنام ہے۔ ایسی ویسی بکری کاٹ کر رحمت بڑی صفائی سے اس کے مادہ اعضاء کی گواہی نکال دیتا۔ پھر اس جگہ کسی بکرے کے نر عضو بڑی صفائی سے ''فٹ'' کر دیتا۔ پھر چیخ چیخ کر گاہکوں کو بلاتا ''اللہ قسم بھائی جان، خصی ہے خصی! ایک نمبر کا مال!''

میاں بھائی تو اندازہ لگا لیتے کہ معاملہ کیا ہے، لیکن چوری چھپے مٹن کھانے والے ہندو گاہک کیا سمجھتے! وہ تو ویسے ہی نظر بچا کر مٹن خریدنے آتے یا پھر ان کے شاگرد آتے۔ انہیں بیوقوف بنانا تو رحمت کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ آسانی سے اس کے جھانسے میں آجاتے۔

خالو سے اچھے تعلقات کی وجہ سے رحمت چیکوا انہیں صحیح مال دیتا۔

☆☆

## دس

قصہ کوتاہ یہ کہ جمعہ کی نماز پڑھ کر جب خالو گھر آئے تو وہ اکیلے نہ تھے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔

خالو نے انہیں پہلے کمرے میں پلاسٹک کی کرسی پر بٹھایا۔ پھر پسینہ پونچھتے ہوئے اندر آواز لگائی۔ ''پیچھے والا کولر بند ہے کا؟''

خالہ اندر سے بڑبڑائی۔ ''باہر آگ برسن لاگ ہے، تا موا کولر کتنا ٹھنڈک کری؟''

واقعی اس سال گرمی بہت پڑی تھی۔

پھر خالو نے یونس کو آواز دے کر گھڑے سے دو گلاس ٹھنڈا پانی منگوایا۔

یونس پانی لے کر آیا۔ دیکھا کہ آنے والا ایک خوبصورت نوجوان ہے۔ خالو نے اسے اس طرح گھورتے ہوئے دیکھ کر ڈانٹا۔ ''سلام کرو۔''

یونس نے سلام کیا۔

خالو اس شخص سے بات کرنے لگے۔ ''ساڑھو کا بیٹا ہے۔ یہیں ''ایم سی اے'' میں پیلوڈور چلاتا ہے۔ آج کل مسلمانوں کا ہنر ہی تو سہارا ہے۔ نوکری میں تو ''میم'' کی کٹائی تو آپ دیکھتے ہی ہیں۔''

یہاں خالو کا ''میم'' سے مطلب عربی کے ''م'' حرف سے تھا۔ میم معنی ہندی کا ''ما''۔ دوسرے الفاظ میں میم معنی مسلمان۔

آنے والے کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''غلط بات ہے بھائی جان، حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ میاں لوگ ''ایجوکیشن'' پر کہاں توجہ دیتے ہیں۔ اپنے پاس گھر ہو نہ ہو، کپڑے لتے ہوں نہ ہوں، بچوں کی کتاب کاپی ہو نہ ہو لیکن تھوڑی کمائی آئی نہیں کہ نواب بن جائیں گے۔ گوشت پلاؤ اڑائیں گے۔ بچے دھڑا دھڑ پیدا کیے جائیں گے۔ اللہ میاں ہیں ہی رزق دینے کے لیے۔''

ان صاحب نے جیسے یونس کے من کی بات کی ہو۔

یہی تو سچ ہے۔ خالی پیلی اپنے ہندو بھائیوں کو کوسنا کہاں تک صحیح ہے۔ انسان کو پہلے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے۔ کہاں کمی ہے؟ یہ نہیں کہ مائیک اٹھایا اور لگے کوسنے غیروں کو۔

تب تک خالہ بھی کمرے میں آ گئیں۔

خالو نے باہر سے آنے والے کا خالہ سے تعارف، جمال صاحب کے نام سے کرایا۔ بتایا ان کے نئے صاحب ہیں۔ ناگپور کے رہنے والے ہیں۔

خالہ نے انہیں سلام کیا۔

خالہ وہیں تخت پر بیٹھ کر جمال صاحب کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ بتیس تینتیس سال کے جوان تھے۔ سانولی رنگت اور چہرے پر موٹی مونچھیں۔ کچھ کچھ سنجے دت کی طرح کا ہیئر اسٹائل۔ جمال صاحب سے خالہ نے عادتاً پوچھا پاچھی شروع کی۔ پتہ چلا کہ ان کے والد ''ویسٹرن کولفی ڈس لمیٹیڈ'' کی کسی کان میں کارک مینیجر ہیں۔ جمال صاحب کی شادی نہیں ہوئی ہے، اسی لیے انہوں نے کواٹر الاٹ نہیں کروایا تھا۔ وہ آفیسرس گیسٹ روم میں رہتے ہیں۔

گرمی کے مارے جیسے جان نکلی جا رہی ہو۔

خالہ اپنی آنچل سے پنکھے کا کام لینے لگیں، جس سے ان کے پیٹ کا کچھ حصہ اور سینہ نظر آنے لگا۔

جمال صاحب نے جو سمجھا ہو، لیکن یونس کو یہ سب بہت برا لگا۔

خالہ جمال صاحب سے بے تکلف ہوئیں اور ان کو کھانے کی دعوت دیں۔

پھر کیا تھا۔

وہیں تخت پر دسترخوان بچھایا گیا۔

باورچی خانے میں صنوبر نے جو سلاد کے لیے پیاز کاٹے تھے، اس کو مہمان کے لیے پیش کیا جانے لگا۔ خالو اور جمال صاحب نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا۔

بیچ میں ایک بار سالن کم پڑا تو سنوبر کو آواز دے کر خالو نے بلایا تھا۔

صنوبر ایک کٹوری سالن پہنچا آئی تھی۔

صنوبر کا سالن پہنچانا یونس کو اچھا نہیں لگا۔

خالہ نے صنوبر کا تعارف جمال صاحب سے کرایا - ''بڑی بٹیا ہے۔ نوویں میں پڑھتی ہے۔''

صنوبر نے جمال صاحب کو سلام کیا تو خالہ نے ٹوکا - ''گدھی، کھاتے وقت سلام نہیں کرتے نہ!''

صنوبر شرما کر بھاگ گئی۔

☆☆

# گیارہ

پھر جمال صاحب خالہ کے گھر اکثر آنے لگے۔

خالو گھر میں ہوں یا نہ ہوں، خالہ ان کی خوب خاطر تواضع کرتیں۔

جمال صاحب آتے تو ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتے۔ گھر میں اردو کا ایک اخبار آتا تھا۔ خالہ سنوبر سے ان کے لیے بھجیے پکوڑی تلواتیں۔ جمال صاحب کڑی پتی اور کم چینی والی چائے بڑے شوق سے پیتے۔ گھر میں اچھے کپ نہ تھے۔ خالہ نے برتن والے کی دکان سے بون چائنا والا قیمتی کپ سیٹ خریدا تھا۔

جمال صاحب کا پروموشن ہوا تو وہ مٹھائی کا ڈبا لے کر آئے۔

یونس اس دن گھر پر ہی تھا۔

رس ملائی کی دس کٹوریاں تھیں۔ بنارسی سویٹس کی خاص مٹھائی۔

خالہ نے تو رس ملائی کھا کر اعلان کر دیا کہ اپنی اس زندگی میں انہوں نے ایسی عمدہ مٹھائی کبھی نہیں کھائی تھیں۔ خالو ٹھہرے کنجوس۔ چھینا کی مٹھائی کبھی لاتے نہیں۔ فاتحہ درود کے لیے وہی منوہرا کے ہوٹل سے خوب میٹھے پیڑے لے آتے۔

کبھی کوئی آیا یا کسی کے گھر گئے تو کھوئے کی مٹھائیاں یا بسکٹ وغیرہ سے استقبال ہوتا۔ رس ملائی جیسی مٹھائی انہوں نے کبھی نہیں کھائی تھیں۔

رس ملائی کا رس جو کٹوری میں بچا تھا، وہ اسے سڑکتے ہوئے پینے لگیں۔

جمال صاحب ہنس دیے۔

صنوبر، چھوٹکی اور دوسرے بچوں کے ساتھ یونس نے بھی مکمل ذائقہ لیتے ہوئے رس

ملائی کھائی۔

خالہ اپنی دیہاتی زبان پر اتر آئیں جس کا لب ولباب تھا کہ واقعی دنیا میں ایک سے ایک لذیذ چیزیں ہیں۔

اس طرح جمال صاحب اس خاندان میں ایک رکن کی طرح شامل ہو گئے۔

جب ان کا دل گیسٹ ہاؤس کے کھانے سے اکتا جاتا تو وہ بلا تامل خالہ کے گھر آ جاتے۔ وہ چاہے کیسا بھی وقت ہو، خالہ اور صنوبر، ان کے لیے فوراً کچھ نہ کچھ کھانے کا انتظام ضرور کر دیتیں۔

جمال صاحب کے سامنے کبھی کبھی خالہ صنوبر کو ڈانٹنے لگتیں یا گالیاں دینے لگتیں تو صنوبر ناراض ہو جاتی۔ اس آواز میں سسکتی کہ جمال صاحب تک اس کی ناک سڑ کنے کی آواز پہنچ جائے۔

پھر جمال صاحب خالہ کو سمجھاتے کہ اتنی ہوشیار سمجھدار بیٹی کو اس طرح نہیں ڈانٹا مارا کرتے۔ صنوبر تو گھر رکھتی ہے۔ سبھی کا خیال رکھتی ہے۔

صنوبر انہیں جمال انکل کہتی۔

یونس انہیں صاحب ہی کہتا۔

پورے گھر والوں میں جمال صاحب کی بڑھتی جا رہی مقبولیت سے اس کو چڑھ ہونے لگی۔

چڑھ کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جمال صاحب کے آنے جانے سے سنوبر اب یونس کا خاص خیال نہیں رکھ پاتی تھی۔

یونس ٹھیکیداری مزدور ٹھہرا! اس کی ڈیوٹی کا ٹائم بڑا اٹ پٹا تھا۔ کبھی ایک دم صبح جانا پڑتا اور کبھی رات کے بارہ بجے بلوا لیا جاتا۔ کبھی رات کے بارہ ایک بجے گھر واپس لوٹتا۔ کپڑے میلے کچلے ہو جاتے۔ کپڑوں میں گریس موبی آئل کے داغ لگے ہوتے۔

پہلے عادتاً وہ کپڑے خود دھوتا تھا۔ پھر صنوبر مہربانی کر کے اس کے کپڑے دھونے لگی۔

اب یہ یونس کا حق بن گیا کہ سنوبر ہی اس کے کپڑے دھوئے۔

جمال انکل کی وجہ سے صنوبر کو اب باورچی خانے میں کچھ زیادہ وقت دینا پڑتا تھا۔ خالہ تو صرف ہا ہا، ہی ہی کرتی رہتیں۔ کبھی پاپڑ تلنے کے لیے کہیں گی، کبھی چائے بنانے کا حکم جاری کریں گی۔

خالو آجاتے تو وہ بھی پوچھا کرتے کہ صاحب کی خدمت میں کوئی کسر تو نہیں رہ گئی ہے۔
یونس نے یہ بھی محسوس کیا کہ خالہ جمال صاحب کے سامنے صنوبر کو کچھ زیادہ ہی ڈانٹتی ہیں۔
اس سے جمال صاحب انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بچوں کو پیار سے سمجھانا چاہیے۔
اکثر اس بات پر صنوبر سسکنے لگتی۔
جمال انکل اسے اپنے پاس بلاتے اور بٹھا کر سمجھاتے کہ ماں باپ کی بات کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ساتھ ہی ساتھ وہ خالہ کو بھی سمجھاتے کہ بچوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔
پھر وہ دن بھی آیا کہ جمال صاحب نے آفیسرس گیسٹ ہاؤس کے میس میں کھانا بند کر دیا اور خالو کے گھر میں ان کا کھانا بننے لگا۔
جیپ آتی اور صبح کا ناشتہ کر کے وہ کان چلے جاتے۔دوپہر کے کھانے کا پکا نہیں رہتا۔ اگر دیر ہو جاتی تو وہ وہیں کہیں کینٹین وغیرہ میں کچھ کھا پی لیتے۔ رات کا کھانا وہ خالو کے گھر ہی کھاتے۔انہوں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کچھ پیسے بھی دینے چاہے، لیکن خالہ نے منع کر دیا۔
اس کے بدلے وہ خود کبھی گوشت اور کبھی دیگر چیزوں کے لیے جیب سے پیسے نکال کر دیتے۔
کل ملا کر وہ بھی گھر کے مستقل رکن بن چکے تھے۔
رات کے دس گیارہ بجے تک وہ گھر میں ڈٹے رہتے۔کبھی ٹی وی دیکھتے اور کبھی بچوں کو پڑھانے لگتے۔بچوں کے ساتھ وہ ہنسی مذاق بہت کرتے، جس سے بچوں کا دل لگا رہتا۔
اڑوسیوں پڑوسیوں کے سامنے خالہ خالو کا سینہ چوڑا ہوتا رہتا کہ ایک افسر ان کا رشتہ دار ہے۔خالہ جمال صاحب کو اپنا دور کا رشتہ دار بتاتیں، ادھر خالو انہیں اپنا رشتہ دار ثابت کرتے۔ویسے وہ ان دونوں کے رشتہ دار کسی بھی زاویہ سے ہو نہیں سکتے تھے کیونکہ خالہ خالو تو ایم۔پی۔کے تھے اور جمال صاحب ناگپور کی طرف کے رہنے والے۔
لوگوں کو اس سے کیا فرق پڑتا۔
آپ اپنے گھر میں جسے بلاؤ، بٹھاؤ، کھانا کھلاؤ پلاؤ یا سلاؤ۔اس سے محلے والوں کی صحت پر کیا فرق پڑ سکتا ہے۔بس، فرصت میں سبھی اس گھر میں پنپ رہے کسی نئے رشتے کے، کسی

نئی کہانی کے پیدا ہونے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔

یونس کو جمال صاحب کا اس طرح گھر میں چھا جانا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ خالہ بھی جمال صاحب کے سامنے خوب چہکتی رہتی ہیں۔ صنوبر کے بھی ہاؤ بھاؤ ٹھیک نہیں رہتے ہیں۔ سبھی جمال صاحب کو لبھانے کی تیاری میں مشغول نظر آتے ہیں۔

ایک دن یونس نے خالہ کے منھ سے سنا کہ وہ جمال صاحب کو اپنا داماد بنانا چاہ رہی ہیں۔

ارے، یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کہاں جمال صاحب اور کہاں پھول سی لڑکی صنوبر۔

دونوں کی عمر میں سولہ سترہ سال کا فرق......

کیا یہ کوئی معمولی فرق ہے؟

خالہ کہنے لگیں۔ ''جب تیرے خالو سے میرا نکاح ہوا تب میں بارہ سال کی تھی اور تیرے خالو تیس برس کے جوان تھے۔ کیا ہم لوگ میں نبھ نہیں رہی ہے؟''

یونس کیا جواب دیتا۔

صنوبر نے بھی تو اس منصوبے کی مخالفت نہیں کی تھی۔ کہیں اس کے دل میں بھی تو افسرائن بننے کی خواہش نہیں؟

یونس کے پاس خانہ بدوشی کی زندگی اور سہولتوں کی کمی کا انبار ہے جبکہ جمال صاحب کے ساتھ کا مطلب پانچوں انگلیاں گھی میں ہونا۔

## بارہ

تبھی دوسری گھنٹی بجی۔

ٹنن .........ٹنن .........ٹنن .........

سنگرولی کے ایک اسٹیشن سے پہلے گاڑی چھوٹنے کا سگنل۔ یعنی اگلے پندرہ منٹ بعد گاڑی پلیٹ فارم پر آجائے گی۔ مسافر مستعد ہوئے۔

یونس کے اندر گھر بنا چکا خوف ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ خالو کبھی بھی آسکتے ہیں۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے پانڈے انکل ان سب معاملات میں بہت تیز ہیں۔ خالو کہیں ان کی 'بلٹ' میں بیٹھ کر دھک دھکاتے آنہ رہے ہوں۔ ایک بار گاڑی پکڑا جائے، اس کے بعد ''پھر ہم کہاں تم کہاں!''

پلیٹ فارم پر وہ ایسی جگہ کھڑا تھا، جہاں سردی سے بچنے کے لیے ریلوے ملازمین نے کوئلہ جلا رکھا تھا۔ اس جگہ سے مرکزی دروازے پر آسانی سے نظر رکھی جا سکتی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا اگر خالو دکھائی دیے تو وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر پلیٹ فارم کے اس پار کھڑی مال گاڑی کے پیچھے چھپ جائے گا۔ اس درمیان اگر پسینجر آئی تو خاموشی سے چڑھ کر سنڈاس میں چھپ جائے گا۔ پھر کہاں ڈھونڈ پائیں گے خالو اسے۔

اسے معلوم نہیں کہ اب وہ گھر لوٹ بھی پائے گا یا اپنے بڑے بھائی سلیم کی طرح اس دنیا کے مہاساگر میں کہیں کھو جائے گا۔

یونس کو سلیم کی یاد ہو آئی......

اسے یہی لگتا کہ سلیم مرا نہیں بلکہ ہمیشہ کی طرح گھر سے روٹھ کر پردیس گیا ہے۔ کسی روز ڈھیر سارا تحفہ لیے ہنستا مسکراتا سلیم گھر ضرور لوٹ آئے گا۔

سلیم، یونس کی طرح ایک روز گھر سے بھاگ کر کسی ''پردیس'' چلا گیا تھا۔ ''پردیس''

جہاں نوجوانوں کی بڑی کھپت ہے۔ ''پردیس'' جہاں خواب کو سچ بنانے کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ وہ ''پردیس'' چاہے دہلی ہو یا ممبئی، کلکتہ ہو یا احمد آباد۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے لوگوں کا ''پردیس'' واقعی پردیس ہوتا ہے، وہ امریکہ، برطانیہ، گلف وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

یونس اپنے آبائی شہر کی یاد کو کب کا بھلا چکا ہے۔ اس جگہ میں یاد رہنے کے قابل کشش ہی کہاں تھی؟ مدھیہ پردیش کے پسماندہ علاقے کا ایک گمنام شہر کوتما...

اردگرد کی کوئلہ کانوں کی وجہ سے یہاں کی تجارتی سرگرمیاں ٹھیک ٹھاک چلتی ہیں۔

شہر کے علاقے میں بیرونی لوگ آ بسے اور شہر کی سرحد کے باہر اصل شہڈ ولی سبھی بے گھر ہوتے گئے۔ یہاں ریل اور سڑک ٹریفک کی سہولت ہے۔ ایک دو پسینجر گاڑیاں آتی ہیں۔ پاس میں انوپ پور اسٹیشن ہے جہاں سے کٹنی یا پھر بلاس پور کے لیے گاڑیاں ملتی ہیں۔

کوتما اس روٹ کا بڑا اسٹیشن ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سفر کے دوران کوتما آتا ہے تو مسافروں کو خود بخود پتہ چل جاتا ہے۔ کوتما واسی اپنے حقوق کے لیے لڑ مرنے والے اور فرائض کے تئیں لاپرواہ قسم کے ہیں۔ ہلا غلہ، غیر ضروری لڑائی جھگڑے کی آواز سے مسافروں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرتِ کوتما آ گیا۔ ٹرین میں پہلے سے جگہ پا چکی سواریاں چوکنا ہو جاتی ہیں کہ کہیں دادا قسم کے لوگ انہیں اٹھا نہ پھینکے۔

کوتما میں ہندو مسلمان سبھی لوگ رہتے ہیں لیکن نگر کے ایک کونے میں ایک مضافاتی علاقہ ہے لہسوئی۔ جسے کوتما کی اکثریت ''منی پاکستان'' کہتی ہے۔ جس کے بارے میں کئی خیالات اکثریت کے دل و دماغ میں پختہ ہیں۔ جیسے لہسوئی کے باشندے عموماً جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ یہ لوگ مزاجی طور سے مجرمانہ مزاج کے حامل ہیں۔ ان کے پاس دیسی کٹے طمنچے، برچھی بھالے اور کئی طرح کے اسلحے رہتے ہیں۔ لہسوئی میں کھلے عام گائے ذبح ہوتی ہے۔ لہسوئی کے باشندے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی طاقت لڑائی نہیں لے سکتی۔ یہ بڑے منظم ہیں۔ پولیس بھی ان سے گھبراتی ہے۔

لہسوئی اور کوتما کے بیچ کی جگہ پر واقع ہے یادو جی کا مکان۔ اسی میں کرائے دار تھا یونس کا خاندان۔

''املی گولائی'' کے نام سے جانا جاتا ہے وہ علاقہ۔

یادو جی کوئلہ کان میں سکیورٹی انسپکٹر تھے۔ وہ 'باندا' کے رہنے والے تھے۔ گھر کے اکلوتے چراغ۔ شاید اسی لیے نام ان کا رکھا گیا تھا کل دیپ سنگھ یادو۔

اس لیے گاؤں میں ان کی بیوی کھیت اور گھر کی دیکھ بھال کیا کرتی۔ یادو جی اسی وجہ سے پردیس میں اکیلے ہی زندگی بسر کرنے لگے۔ شروع میں تھوڑے وقفے کے بعد چھٹیاں لے کر گھر جایا کرتے تھے۔ پھر کوئلہ کان علاقے میں آسانی سے منہ مارنے کا جگاڑ پا کر ان کا دیس جانا کم ہوتا گیا۔

کل دیپ سنگھ یادو جی مزاج میں چنچل نوعیت کے تھے۔ دیس میں ''باون بیگھہ پودینہ'' اگانے والے یادو جی کا ادھر ادھر منہ مارتے مارتے، ایک نوجوان بیوہ کے ساتھ ایسا ٹانکا بھڑا کہ ان کی بھٹکی ہوئی کشتی کو کنارہ مل گیا۔

وہ بیوہ ''پنیکا'' ذات کی عورت تھی۔ وہ بھی کئی گھاٹ کا پانی پی چکی تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ بھی اب تھک گئی ہو۔ دونوں نے وفاداری کی اور تاحیات ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں۔

پنیکائن، یادو جی کے نام سے خوب گاڑھا سندور اپنی مانگ میں بھرنے لگی۔

یادو جی بھی چھنرئی چھوڑ کر اس پنیکائن کے پلو سے بندھ گئے۔

آہستہ آہستہ ان کا چھٹے چھما ہی دیس جانا بند ہوا اور پھر دیس میں بھیجے جانے والے منی آرڈر کی رقم میں بھی کمی ہونے لگی۔

یادو جی کے حریفوں نے یادو جی کی اپنے اہل خانہ سے بے پروائی کی خبر دیس میں یادوائن تک پہنچائی۔

یادوائن بڑی سیدھی سادی دیہاتی عورت تھی۔ اس نے گھر میں محنت کر کے بال بچوں کو پالا پوسا تھا۔ گاؤں گراوں کے گائے گوبر، کیچڑ مٹی اور بغیر بجلی بتی کی تکلیفوں کو جھیلا تھا۔ یادو جی کی بے وفائی اسے کہاں برداشت ہوتی۔ اس نے اپنے جوان ہوتے بچوں کے دلوں میں باپ کے خلاف نفرت کے بیج بوئے۔

بچے جوان ہوئے تو انہیں ناکارہ باپ کو سبق سکھانے کو تما بھیجا۔

بچے کوتما آئے اور انہوں نے اپنے باپ کو نئی ماں کے سامنے ہی خوب مارا پیٹا۔

جب یادو جی لڑکوں سے دم بھر پٹ چکے تب کوئلے کی کان میں بسے ان کے پڑوسیوں

نے آ کر بیچ بچاو کیا۔

اس واقعہ سے یادو جی کی خوب تھو تھو ہوئی۔

مزدور یونین کے لیڈران، کان کے ملازم اور یادو جی کے بچوں کے درمیان پنچایت ہوئی۔ یادو جی کی جائز بیوی کی قربانی اور صبر کی تعریفیں ہوئیں۔ یادو جی کے چنچل کردار اور نئی بیوی کی موزونیت پر خوب بحث ہوئی۔ پھر متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ بینک میں یادو جی کے اکاؤنٹ سے ہر ماہ تین ہزار روپے 'باندا' میں ان کی بیوی کے اکاؤنٹ میں بھیجا جائے گا۔

اگر یادو جی اس سے انکار کریں گے تو پھر انجام کے لیے خود ذمہ دار ہوں گے۔ لڑکے جوان ہو ہی گئے ہیں۔

پنیکائن چنچناتی رہ گئی یادو جی نے ان نئے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ یادو جی سوچ رہے تھے کہ یہ بلا کیسے بھی ٹلے، ٹلے تو سہی۔

بینک منیجر نے نظام بنا دیا۔ تنخواہ جمع ہوتے ہی تین ہزار روپے کوتما سے نکل کر باندا میں ان کی بیوی کے اکاؤنٹ میں جمع ہونے لگے۔ اس طرح سارے جذباتی تعلق ختم کر کے بچے گاؤں واپس چلے گئے۔

یادو جی بال کالے نہ کرائیں تو ایک دم بوڑھے نظر آئیں۔ دانت ٹوٹ جانے کی وجہ سے گال پچک گئے ہیں اور چہرہ چوہے جیسا نظر آتا ہے۔ بنیان چڈی میں مکان کے باہر بنے کھٹال میں گائے بھینس کو گھاس بھونسا کھلاتے رہتے ہیں۔ پانی ملے دودھ کے کاروبار کی دیکھ بھال خود کرتے ہیں۔

پنیکائن کی جوانی اب ڈھل رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ عورت اپنی ادھیڑ عمر میں زیادہ نشیلی ہوتی ہے۔ یہ فارمولا پنیکائن پر فٹ بیٹھتا ہے۔ پانچ فٹ اونچی پنیکائن۔ زبردست قد کاٹھی۔ بھرا بھرا بدن۔ دودھ گھی سمیت مطمئن زندگی پا کر پنیکائن کتنا چکنا گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یادو جی کو بالکل ''چوس ڈالی'' ہے یہ عورت!

یونس جب بچہ تھا تب اس نے ان دونوں کو کھٹال میں بچھی چارپائی پر ناکافی لباس میں گتھم گتھا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

یہ تھا یونس کی فٹ پاتھی یونیورسٹی میں 'کام شاستر' کا عملی کورس......

## تیرہ

کوتما اور اس جیسے نگر یا قصبوں میں یہ رسم جانے کب سے چلی آ رہی ہے کہ جیسے ہی کسی لڑکے کے پر اُگے نہیں کہ وہ شہر کے گلی کوچوں کو ''ٹاٹا'' کہہ کر ''پردیس'' اڑ جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ''پردیس'' میں سینکڑوں ایسے ٹھکانے ہیں جہاں نوجوانوں کی بے حد ضرورت ہے۔ جہاں ہندوستان کے تمام صوبے کے نوجوان کام کی تلاش میں آتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح، جس طرح بڑے شہروں کے نوجوان اچھے مستقبل کی تلاش میں بیرون ملک جانے کو بیتاب رہتے ہیں۔

'سرسا' کے منھ جیسے ہیں یہ صنعتی مکڑ جال۔

بہتر زندگی کی تلاش میں بھٹکتے جانے کتنے نوجوانوں کو نگلنے کے بعد بھی سرسا کا پیٹ نہیں بھرتا۔ کبھی اس کا جی نہیں اگھاتا۔ اس کی ڈکار کبھی کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ تبھی تو ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے بے شمار نوجوان اپنی پھوٹی قسمت جاگانے بڑے شہروں کی جانب بھاگے چلے آتے ہیں۔

اپنی جنم بھومی، گاؤں گھر، ماں باپ، بھائی بہن، دوست یار اور کمسن محبوبہ کو چھوڑ کر۔

ان نوجوانوں کو دکھائی دیتا ہے پیسہ، خوب سارا پیسہ۔ اتنا پیسہ کہ جب وہ اپنے گاؤں واپس جائیں تو ان کے ٹھاٹ دیکھ کر گاؤں والے ہکے بکے رہ جائیں۔

دیکھنے والے لوگ دانتوں تلے انگلیاں دبا کر کہیں کہ بیٹوا نکما آوارہ نہیں بلکہ کتنا ہوشیار نکلا!

لیکن کیا ان کے خواب پورے ہو پاتے ہیں۔

حقیقتاً ان کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

روپیہ کمانا کتنا مشکل ہوتا ہے، انہیں جب پتہ چلتا تب تک وہ شہر کے پیٹ کی آگ

بجھانے والی بھٹی کے لیے ایندھن بن چکے ہوتے ہیں۔شروع میں انہیں شہر سے محبت ہوتی ہے۔ پھرانہیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی جوانی کا مدھررس چوسنے والی دولت مند بڑھیا کی طرح ہے یہ شہر۔ جو ہردن نئے نئے طریقے سے سج سنور کران پر ڈورے ڈالتی ہے۔انہیں کرارے،کرارے نوٹ دکھا کراپنی طرف بلاتی ہے۔صدیوں کی عدم محرومی اور تکلیفوں سے جوجھتے یہ نوجوان اس بڑھیا کے اشارے پرناچتے چلے جاتے ہیں۔

بڑھیا کے رنگ روغن والے جسم سے ان کونفرت ہو اٹھتی ہے، لیکن اس سے نفرت کا اظہار کس قدر مہلک ہوگا انہیں اس کا اندازہ رہتا ہے۔

انہیں پتہ ہے کہ ملک میں بھوکے بے روزگار نوجوانوں کی کمی نہیں۔ بڑھیا فوراً دوسرا نوجوان تلاش کر لے گی۔

شہر میں رہتے رہتے وہ نوجوان گاؤں میں انتظار کر رہی اپنی محبوبہ کو کب بھول جاتے ہیں، انہیں پتہ ہی نہیں چل پاتا ہے۔ان کے احساسات شہر کی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔وہ جیب میں ایک ڈائری رکھتے ہیں جس میں مطلب بھر کے کئی پتے، ٹیلی فون نمبر وغیرہ درج رہتے ہیں،صرف اس ایک پتے کو چھوڑ کر، جہاں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔جس جگہ کی مٹی اور پانی سے ان کے جسم کو شکل ملی تھی۔ جہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں ان کے بوڑھے ماں باپ ہیں۔جہاں کھٹی میٹھی محبت کا ''ڈھائی اچھر'' والا سبق پڑھایا گیا تھا۔جہاں کی یادیں ان کی زندگی کا سرمایہ بن سکتی تھیں۔

ہاں، وہ اتنا ضرور محسوس کرتے کہ اب اس شہر کے علاوہ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

پتہ نہیں، شہر انہیں پکڑ لیتا ہے یا یہ کہ وہ شہر کو جکڑ لیتے ہیں۔

ایک غفلت انہیں ساری زندگی شہر میں جینے کا آسرا دیے رہتی ہے کہ یہی ہے وہ منزل، جہاں ان کی پرانی پہچان گم ہو سکتی ہے۔

یہی ہے وہ دنیا جہاں ان کی نئی پہچان بن پائی ہے۔

یہی ہے وہ جگہ، جہاں انہیں ''فلاں کا بیٹا'' یا یہ کہ ''ارے-ابے- تبے'' جیسے تخاطب سے پکارا نہیں جائے گا۔ جہاں ان کا ایک نام ہوگا جیسے -سلیم،شیام،موہن،سوہن...

یہی ہے وہ دنیا، جہاں چمڑی کی رنگت پر کوئی توجہ نہیں دے گا۔آپ گورے ہوں یا کالے، لمبے ہوں یا ناٹے۔مہانگری تہذیب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یہی ہے وہ جگہ، جہاں وہ ہوٹل میں، بس میں، ٹرین میں، نائی کی دکان میں، سب کے برابر کی حیثیت سے اٹھ بیٹھ سکیں گے۔

یہیں ہے وہ منزل، جہاں ان کی ذات برادری اور سماجی حیثیت پر کوئی تبصرہ نہیں ہوگا، جہاں ان کے سونے جاگنے، کھانے پینے اور اٹھلانے کا حساب وکتاب رکھنے میں کوئی دلچسپی نہ لے گا۔ جہاں وہ ایک دم آزاد ہوں گے۔ اپنے دن اور رات کے پورے پورے مالک۔

لیکن کیا یہ ایک غفلت کی جگہ ہے؟ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟

پھر بھی اگر یہ ایک وہم ہے تو بھی ''دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔'' اسی غفلت کے سہارے وہ انجان شہروں میں زندگی گزارتے ہیں۔ تاحیات اپنی چھوٹی چھوٹی، بالکل چھوٹی سی خواہشات کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔

کتنے معمولی ہوتے ہیں ان کے خواب!

لوکل بس یا ٹرین کے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے فاصلے پر ملے عارضی کام۔ ایک چھوٹی سی کھولی۔ بیوی جس پر کرشمہ کپور کا شبہ ہو۔ انگریزی اسکول میں پڑھتے بچے۔ ٹی وی، فریج، کولر۔ چھوٹا سا بینک بیلنس کہ ہاری بیماری میں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

ستم ظریفی دیکھئے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا اور ایک دن حقیقت والی دنیا بکھر جاتی۔ اس خواب نگری کا وہ ایک حصہ بن جاتے۔

گاؤں گراوں سے انہیں کھوجتی بھٹکتی خبریں آکر دستک دیتیں کہ بچوں کے لوٹ آنے کی امید لیے مر گئے بوڑھے ماں باپ۔

خبریں بتاتیں کہ چھوٹے بھائی لوگ زمیندار کی بیکاری کھٹتے ہیں اور پھر سانجھ ڈھلے گانجا شراب میں خود کو غرق کر لیتے ہیں۔

خبریں بتاتیں کہ ان کی جوان بہنیں اپنے تن من کی ضروریات پوری نہ ہونے کی وجہ سے جاگیرداروں کی ہوس کا سامان بن چکی ہیں۔

خبریں بتاتیں کہ ان کی معصوم محبوباؤں کا انتظار میں ڈوبی راتوں کا اماوس کبھی ختم نہیں ہوا۔

اس طرح ایک دن ان کا سب کچھ بکھر جاتا۔

یہ بکھرنا کسی نئی تعمیر کا اشارہ تو نہیں؟

## چودہ

خالہ کا دباؤ تھا، اس لیے خالو کو ''ایکشن'' میں آنا ہی تھا۔

خالو اسے ''مدینہ ٹیلر'' کے مالک بنے استاد کے پاس لے آئے۔

مسجد 'پارا' میں واقع یتیم خانہ کے سامنے انجمن کمیٹی کی جانب سے تین دکانیں بنائی گئی ہیں۔ان دکانوں سے یتیم خانہ کے انتظام کے لیے آمدنی ہو جاتی ہے۔ یہ سبھی دکانیں مسلمان تاجروں کو ہی دی جاتیں۔ایک دکان میں آٹا چکی تھی، دوسرے میں کرانا اور تیسری دکان کے ماتھے پر ٹنگا بورڈ مدینہ ٹیلر، سوٹ، اسپیشلسٹ مدینہ ٹیلر کے مالک تھے بنے استاد۔ بنے استاد ایک روایتی درزی تھے۔ کہتے ہیں شروع میں وہ لیڈیز ٹیلر کے نام سے جانے جاتے تھے۔ پیسے کما کر خود کاریگر رکھنے لگے اور پھر اچانک نام والے بن گئے۔آج کل شادی بیاہ کے موقع پر متوسط خاندان کے دولہا کے لیے کوٹ پینٹ ضرور بنواتے ہیں۔شادی میں جو ایک بار تھری پیس سوٹ آدمی پہن لیتا ہے، پھر اپنی زندگی میں اپنے اخراجات سے وہ کہاں ایک بھی سوٹ سلوا پاتا ہے۔ اگر قسمت سے بیٹے کا باپ بنا تو پھر مستقبل میں سمدھی کے بجٹ پر بیٹے کی شادی میں کوٹ سلوا سکے تو اس کی قسمت! بنے استاد شہر سے اچھے کاریگر اٹھا لائے تھے، جس کی وجہ سے ان کی دکان ٹھیک ٹھاک چلا کرتی۔

ان کا لباس بڑا ہی مضحکہ خیز ہوتا۔علی گڑھیا پاجامے پر کڑھائی والا بادامی کرتہ۔آنکھیں اس طرح مچ مچاتے جیسے بہت تیز دھوپ میں کہیں دور کی چیز کو غور سے دیکھ رہے ہوں۔ ہنستے بولتے تو اوبڑ کھابڑ میلے دانتوں کی وجہ سے چہرہ بندر جیسا دکھائی دیتا۔

یونس، بنے استاد کا حلیہ دیکھ بمشکل اپنی ہنسی روک سکا۔

خالو کے سامنے انہوں نے یونس کو بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا۔ یونس نے انہیں

سلام کیا تو بنے استاد نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
یونس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی دیر تک نصیحتوں کی بوچھار کرتے رہے۔
''درزی گیری آسان پیشہ نہیں برخوردار! ٹیڑھے مینڈھے کپڑے سل کر آج کوئی بھی درزی بن جاتا ہے، ہے نہ...! بڑا مشکل ہنر ہے ٹیلرنگ، سمجھے۔ شہر کے سبھی نامور ٹیلر میرے شاگرد رہے ہیں۔ ''پوشاک ٹیلرس'' والا منور انصاری ہو یا ''ماڈرن ٹیلر'' والے قاسم میاں، سبھی اس ناچیز کی مار ڈانٹ کھا کر آج شان سے کما کھا رہے ہیں، ہے نہ......''
خالو ان کی بات کی حمایت میں سر ہلا رہے تھے۔
یونس کا ہاتھ استاد نے چھوڑا نہیں تھا، کبھی ان کی گرفت ہلکی پڑتی کبھی سخت۔ یونس چاہتا تھا اس کے ہاتھ گرفت سے آزاد ہو جائیں، لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی جدوجہد کو بنے استاد بھانپ رہے ہیں۔
وہ بڑی تندہی سے اپنی تعریف کر رہے تھے اور یونس کی ہتھیلی پسینے سے بھیگ گئی۔ اس نے خالو کو دیکھا جو بے فکر بیٹھے تھے۔
اچانک بنے استاد نے اسے اپنے قریب کھینچا۔ یونس نے سوچا کہ کہیں یہ گود میں بٹھانا تو نہیں چاہتے۔
اس کے جسم نے مخالفت کی۔
اس کے بدن کی اکڑن کو استاد نے محسوس کیا اور ہاتھ چھوڑ کر یونس کی پیٹھ سہلانے لگے۔ ''دیکھو برخوردار، ہاں کیا نام بتایا تم نے اپنا...... ہاں یونس۔ یہاں کئی لڑکے کام سیکھ رہے ہیں، ہے نہ...... ان سے گپے بازی مت کرنا۔ جیسا کام ملے، کام کرنا۔ سلائی مشین چلانے کی جلد بازی مت دکھانا۔ سینئروں کی باتیں ماننا۔ مجھے شکایت ملی تو سمجھو چھٹی، ہے نہ...... اگر لگن رہے گی تو ایک دن تم بھی نایاب ٹیلر بن جاؤ گے، ہے نہ......''
بنے استاد کی نصیحتیں اس کی سمجھ میں نہ آئیں۔
ہاں، ان کے منہ سے نکلتی 'پائریا' کی بدبو سے اس کا دم ضرور گھٹنے لگا تھا۔
یونس نے استاد کے ہاتھوں کو اپنے جسم کی بوٹیوں کا حساب لگاتے نہیں پایا۔ اس نے دیکھا کہ دکان کے کاریگر اور لڑکے دھیمے دھیمے مسکرا رہے ہیں۔

لہٰذا اس نے ''مدینہ ٹیلر'' کے یہاں جانا شروع کر دیا۔

وہ صبح خالہ کے گھر سے ناشتہ کر کے نکلتا تھا۔ دوپہر دو سے تین بجے تک کھانا کھانے کی مہلت ملتی اور رات آٹھ بجے لڑکوں کو چھٹی ملتی۔ کاریگر ٹھیکہ کے مطابق کافی رات تک کام میں مصروف رہتے۔ تیج تہوار یا شادی بیاہ کے موقعے پر تو ساری رات مشینیں چلتی رہتیں۔

یونس کا من دکان میں لگنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ ساتھ کام کرنے والے لڑکوں سے اس بنے استاد کے بارے میں کئی خفیہ جانکاری ملنے لگیں۔

دکان میں چار سلائی مشینیں اور ایک پیکو-کڑھائی مشین تھی۔ سامنے ایک طرف بنے استاد کا کاؤنٹر تھا۔ مشینوں کے پیچھے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی، جس پر شاگردوں کا اڈا ہوتا۔ یہاں کاج بٹن، ترپائی اور تیار کیے گئے کپڑے پر پریس کرنے کا کام ہوتا۔

تینوں شاگردوں سے یونس کا تعارف ہوا۔ یہ سبھی بارہ تیرہ برس کے کمسن بچے تھے۔

ناٹے قد کا بو گٹھیلے بدن کا تھا اور یتیم خانے میں حافظ بننے آیا تھا۔ یتیم خانے کی جیل اور سخت نظم وضبط سے تنگ آ کر وہ بنے استاد کے یہاں ٹک گیا۔

دوسرے کا نام 'جبار' تھا جو پاس کے گاؤں کی بیوہ عورت کا بیٹا تھا۔

تیسرا بڑا ہیر و قسم کا لڑکا تھا۔ بہار کے چھپرا ضلع کا رہنے والا۔ بھوک سے تنگ آ کر اپنے ماموں کے گھر آیا تو پھر یہیں رہ گیا۔ سنہرے بالوں والا چکنا خوبصورت شمیم۔ بنے استاد کا منھ لگا شاگرد۔

شمیم کے پیٹھ پیچھے جبار اور بو اسے ''بنے استاد کا لونڈا'' نام سے یاد کرتے اور فحش اشارہ کر کے خوب ہنستے۔

بو سے یونس کی خوب پٹتی۔

اس نے یونس کو اپنی رام کہانی کئی ٹکڑوں میں بتائی تھی۔ ان کے بیچ خوب نبھتی۔ بنے استاد انہیں سر جوڑے دیکھتے تو کاؤنٹر سے چلاتے-''اے لونڈو! گپ مارنے آتے ہو کا ای ہاں؟''

بو جھارکھنڈ کا رہنے والا تھا۔ اس کے ابا بچپن میں ہی وفات کر گئے تھے۔ وہ پیشے کے لحاظ سے دھنیا تھے۔ شہر شہر پھیری لگا کر رضائی گدے بنایا کرتے۔ ان کا کوئی پکا پڑاؤ نہ تھا۔ خانہ بدوشوں کی طرح زندگی تھی۔

ابا کے انتقال کے دو سال بعد اس کی امی نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلا باپ بو اور اس کی بہن سے نفرت کرتا۔ بہن تو چھوٹی تھی۔ اس سے نفرت محبت میں امتیاز کا کیا پتہ؟ ہاں، بو نفرت سے بھری آنکھوں کا مطلب سمجھنے لگا تھا۔ اللہ میاں سے یہی دعا مانگا کرتا کہ اسے اس دوزخ سے جلد نجات مل جائے۔

تبھی گاؤں آئے مولوی صاحب نے اس سے مدھیہ پردیش چلنے کو کہا۔ بتایا کہ وہاں مسلمانوں کی اچھی آبادی ہے۔ ایک یتیم خانہ بھی ابھی ابھی کھلا ہے۔ بچے وہاں کم ہیں۔ یتیم خانے میں کھانے اور رہنے کا مسئلہ حل ہو جائے گا، ساتھ ہی دینی تعلیم بھی وہ حاصل کر لے گا۔

کہتے ہیں کہ خاندان میں اگر کوئی ایک شخص قرآن مجید کو حفظ کر لے تو اس کی سات پشتوں کو جنت میں جگہ ملتی ہے۔ اس کی دنیا سدھر جائے گی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔ بو کی اماں مولوی صاحب کی باتوں سے متاثر ہوئی اور اس طرح بو ان کے ساتھ یہاں آ گیا۔

مسجد کی چھت پہ بڑے بڑے تین حال تھے۔

ایک حال میں مولوی صاحب رہا کرتے۔ دوسرے حال میں مدرسہ چلایا جاتا۔ تیسرا حال یتیم بچوں کے لیے تھا۔

نہانے دھونے کے لیے مسجد کے باہر ایک کنواں تھا جس میں تقریباً دس فٹ نیچے پانی ملتا تھا۔ یہ بارہ ماسہ کنواں تھا جو کبھی نہ سوکھتا۔ شاید قریب کے نالے کی وجہ سے ایسا ہو۔

طہارت اور وضو کے لیے تو مسجد ہی میں انتظام تھا، لیکن پاخانہ جانے کے لیے ڈبا لے کر مسجد کے اتر کی جانب 'دلپٹس' کے جنگل کی طرف جانا پڑتا تھا۔ شروع کے کچھ دن بو کا من وہاں خوب لگا، مگر وہ گاؤں کے اس آزاد پرندے کی طرح تھا جسے پنجرے میں قید رہنا ناپسند ہو۔

وہاں کے روزمرہ کے معمول سے اس کا دل اچٹ گیا۔

فجر کی اذان صبح پانچ بجے ہوتی۔ اذان دینے سے پہلے مؤذن چیختے ہوئے کسی جنات کی طرح آدھمکتا۔ ''شیطان کے بہکاوے میں مت آو لڑکو۔ جاگ جاؤ۔''

صبح کے وقت ہی تو بے جوڑ نیند آتی ہے۔ ایسی نیند میں رکاوٹ ڈالنا شیطان کا کام ہونا چاہئے۔ مؤذن خواہ مخواہ شیطان کو بدنام کیا کرتا۔ ان معصوم بچوں کی نیند کے لیے شیطان تو وہ خود بن کر آتا۔

مؤذن مردود آکر جسم سے چادریں کھینچتا اور بے دردی سے انہیں اٹھاتا۔ بڑے حافظ جی کے خوف سے لڑکے مخالفت بھی نہ کر پاتے۔ جانتے تھے کہ اگر مؤذن نے بڑے حافظ جی سے شکایت کر دی تو غضب ہو جائے گا۔

کسی طرح من مار کر لڑکے اٹھتے۔

آنکھیں بچ مچاتے کونے میں پردہ کی گئی جگہ پر جا کر ڈھیر سارا پیشاب کرتے۔

حکم تھا کہ نیند میں اگر کپڑے یا جسم ناپاک ہو گیا ہو تو نہانا فرض ہے۔ ناپاک بدن سے نماز ادا کرنے پر اللہ تعالی گناہ کبھی معاف نہیں کرتے۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اس نے کسی لڑکے کو صبح اٹھنے کے ساتھ نہاتے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں، مؤذن یا بڑے حافظ جی ضرور کسی خاص صبح نہایا کرتے تھے۔ اس کا مطلب وہ رات برات ناپاک ہوا کرتے تھے۔

اسے تو وضو کرنا بھی بھاری پڑتا تھا۔ کئی بار اس نے قاعدے سے آنکھ منھ دھوئے بغیر نماز ادا کی تھی۔ بعد میں دعا کرتے وقت وہ اللہ تعالی سے اپنی اس غلطی کے لیے معافی مانگ لیا کرتا تھا۔

ایک صبح اس نے پایا کہ اس کا پاجاما سامنے کی طرف گیلا چپ چپا ہے۔ اس نے اپنے ساتھی محمود کو یہ بات بتلائی تھی۔ پھر اسی حالت میں بغیر نہائے اس نے نماز ادا کی تھی۔

محمود مؤذن کا چمچہ تھا۔

اس نے مؤذن کو ساری بات بتائی اور مؤذن نے اس کی پیشی بڑے حافظ جی کے سامنے کر دی۔

بڑے حافظ جی نے اس کے بدن پر چھڑی سے خوب دھنائی کی۔

وہ خوب رویا۔

اس نے یتیم خانے سے بھاگ جانے کا منصوبہ بنایا۔

بنے استاد کی دکان میں لڑکوں کو کام کرتے دیکھ کر وہ ''مدینہ ٹیلر'' گیا۔ بنے استاد نے اسے کام پر رکھ لیا۔ مولوی صاحب اور بڑے حافظ جی نے بارہا چاہا کہ ببو یتیم خانے میں واپس آئے، لیکن ببو نے اس مسجد میں جانا کیا جمعہ کی نماز پڑھنا بھی بند کر دیا۔ وہ جمعہ پڑھنے ایک میل دور کی مسجد میں جایا کرتا تھا۔

وہاں چار کاریگر تھے۔ ان میں سے تین پتلے دبلے نوجوان تھے جو چوخانے کی لنگی اور بنیان پہنے سر جھکائے مشین سے جوجھتے رہتے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد کوئی ایک بیڑی پینے دکان سے باہر نکلتا۔ باقی دو اس کے واپس آنے کا انتظار کرتے۔ وہ ایک ساتھ دکان خالی نہ کرتے۔ دکان میں کام بہت زیادہ رہتا تھا۔

چوتھے کاریگر سلطان بھائی تھے انہیں بنے استاد پھوٹی آنکھ نہ بھاتے، لیکن سلطان بھائی بڑے ''گرو'' چیز تھے۔

بنے استاد کی غیر موجودگی میں سلطان بھائی کے ہاتھوں میں دکان کی کمان رہتی۔

جب بنے بھائی دکان میں موجود رہتے تب اکثر سلطان بھائی کے لیے استانی کے گھر سے بلاوا آتا۔ کبھی بنے بھائی خود سلطان بھائی کو یہ کہہ کر روانہ کیا کرتے کہ میاں گھر چلے جاؤ، بیگم نے آپ کو یاد کیا ہے۔ ہے نہ......

سلطان بھائی تیس پینتیس سال کے چھرہرے نوجوان تھے۔ ہمیشہ ٹیپ ٹاپ سے رہا کرتے۔

آہستہ آہستہ یونس نے جانا کہ سلطان بھائی کا بنے استاد کی بیوی کے ساتھ چکر چلتا ہے۔ بنے استاد اپنے چکنے شاگرد چھپرا کے لونڈے شمیم کے عشق میں گرفتار ہیں اور جاگیر لٹانے کو تیار رہتے ہیں۔

''مدینہ ٹیلر'' میں تین ماہ گزارے تھے اس نے۔ اس مدت میں اس سے کاج بٹن، تیار ہوئے کپڑوں میں پریس اور ترپائی کے علاوہ کوئی کام نہ لیا گیا۔ کاج بٹن لگاتے اور ترپائی کرتے اس کی انگلیوں میں چھید ہو گئے۔ سوئی کے باریک سوراخ میں دھاگے ڈالتے ڈالتے آنکھیں دکھنے لگیں، لیکن استاد اسے قینچی اور انچی ٹیپ پکڑنے نہ دیتے۔

کاریگر ستر اسی کی رفتار میں سلائی مشین دوڑاتے۔ جانے کتنے میل کی سلائی کا ریکارڈ وہ بنا چکے ہوں گے۔ یونس کا دل کرتا کہ اسے بھی ''ایکو بار'' سلائی مشین چلانے کا موقع مل جاتا۔

ایسا ہی دکھ اس وقت بھی ہوا تھا جب تقریباً سال بھر دل لگا کر فیلڈنگ کروانے کے بعد بھی ان نامراد لڑکوں نے اس کو بلے بازی کا موقع نہیں دیا تھا۔

ہوا یہ کہ محلے میں مگدر کے بلے اور کپڑے کی گیند سے کرکٹ کھیلتے کھیلتے اس کے دل

میں آیا کہ وہ بھی اصلی کرکٹ کیوں نہیں کھیل سکتا ہے؟

وہ شہر کے امیر لڑکوں کی جی حضوری کرتے کرتے ان کے ساتھ کرکٹ کھیلنے جانے لگا تھا۔

ڈاکٹر چترویدی کا لڑکا 'بنٹی' اور دوا بیچنے والے گوئل کا لڑکا 'سمیت' کرکٹ ٹیم کے سربراہ تھے۔ باہر سے ان لوگوں نے کرکٹ کا کافی سامان منگوایا تھا۔ میدان کے پیچھے چپراسی کا گھر تھا، جہاں وہ لوگ کھیلنے کا سامان رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس اصلی بیٹ، بال، اسٹمپ، گلبس، ہیلمٹ اور لیگ گارڈ وغیرہ سامان تھے۔

جب اس نے سال بھر وفاداری کے ساتھ کھیل میں تعاون کے بدلے میں بلے بازی کا موقع حاصل کرنے کی بات کہی تو وہ سب کے سب ہنس پڑے۔

بنٹی نے کہا کہ اگر وہ واقعی کرکٹ کے لیے سیریس ہے تو اسے ایک سو روپے مہینے کی ممبر شپ دینی ہوگی۔

''جھوری میں جھانٹ نہیں سرائے میں ڈیرا''- یہی تو کہا تھا سمیت نے۔

من مسوس کر رہ گیا تھا یونس۔

وہاں بلے بازی کرنے کو نہ ملی اور یہاں بنے استاد کے سخت احکامات کی وجہ سے سلائی مشین پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع نہیں مل پا رہا تھا۔

گھر میں ہاتھ سے چلنے والی سلائی مشین ہے۔ اماں کو سلائی آتی نہیں تھی۔ ابو ہی کبھی سلائی کرنے بیٹھتے تو یونس یا بیبیا سے ہینڈل گھمانے کے لیے کہتے۔ اس مشین میں سلائی بہت سست رفتار سے ہوتی۔ پاؤں سے چلنے والی مشین یوں پھرر... پھرر... چلتی کہ کیا کہنے!

بنے استاد کبھی موڈ میں ہوتے تو بتاتے کہ بڑے شہروں میں آج کل بجلی موٹر سے ''اپٹومیٹک'' مشینیں چلتی ہیں۔ ایسی ایسی دکانیں ہیں جہاں سینکڑوں مشینیں گھرگھراتی رہتی ہیں۔

یہاں جیسا نہیں کہ ایک دن میں ایک کاریگر دو جوڑے کپڑے سل لے، تو بہت۔ وہاں ایک آدمی ایک بار میں کوئی ایک کام کرتا ہے۔ جیسے کچھ لوگ صرف کالر سلتے ہیں۔ کچھ آستین سلتے ہیں۔ کچھ آگے کا حصہ تیار کرتے ہیں۔ کچھ پیچھے کا حصہ تیار کرتے ہیں۔ کچھ کاریگروں کے پاس آستین جوڑنے کا کام رہتا ہے۔ کچھ کے پاس کالر فٹ کرنے کا کام۔ کچھ کاریگر ''فائنل ٹچ'' دے کر کپڑے کو تیار مال والے سیکشن میں بھیج دیتے ہیں۔ جہاں کپڑوں پر پریس کیا جاتا ہے

اورانہیں ڈبوں میں پیک کیا جاتا ہے۔ایک دم کسی فیکٹری کی طرح ہوتا ہے سارا کام۔

یونس خواہش ظاہر کرتا کہ کپڑا کاٹنے کا کام مل جائے یا سلائی مشین پر ہی بیٹھنے دیا جائے۔

بنے استاد حقارت سے ہنس کر جواب دیتے ۔''ابھی تو منجائی چل رہی ہے میاں، اتنی جلدی استادی سکھادی تو میری ہنسائی ہوگی۔لوگ کہیں گے کہ بنے استاد نے کیسا شاگرد تیار کیا ہے۔''

اس کے علاوہ بنے استاد کی ایک عادت اسے ناپسند تھی۔ بنے استاد کام سکھاتے وقت اس کی جانگھ پر چیکوٹیاں کاٹتے ، پیٹھ تھپتھپاتے اوران کا ہاتھ کب بہہ کرکمر کے نیچے پہنچ جاتا انہیں خیال ہی نہ رہتا۔

ان کی غیر موجودگی میں لڑکے استاد کی حرکتوں پر خوب مذاق کرتے۔

چندھیائی آنکھوں اور میلے دانتوں والے بنے استاد کے منھ سے بدبو نکلا کرتی تھی۔

جلد ہی بنے استاد کی ''شاگردی'' سے اس نے خود کو آزاد کرلیا۔اس نے جان لیا تھا کہ ٹیلر ماسٹر کبھی لکھ پتی بن کر عیش کی زندگی نہیں گزارپاتا۔وہ تو تاعمر ''ٹیلری'' ہی کرتا رہ جاتا ہے۔
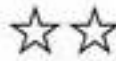
## پندرہ

یونس کی اسکولی تعلیم ہی کھٹائی میں پڑی تھی، کسی یونیورسٹی کا منھ دیکھنا اس کے نصیب میں کہاں تھا؟

ویسے بھی ہر کسی کے مقدر میں یونیوسٹی کی پڑھائی کا ''جوگ'' نہیں ہوتا۔

فٹ پاتھیا لوگوں کی اپنی ایک الگ یونیورسٹی ہوتی ہے، جہاں عملی کتاب کی تمام باتیں سیکھائی جاتی ہیں۔

ہاں، فرق صرف اتنا ہے کہ ان یونیورسٹیوں میں ''مالتھیس'' کی تھیوری پڑھائی جاتی ہے نہ ''ڈاروین'' نظریہ ارتقاء۔

طالب علم خود دنیا کی تمام اعلانیہ، غیر اعلانیہ سائنس اور اصطلاحات میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔

لکچرر کی اہلیت کے لیے تعلیم اور عمر کی پابندی نہیں ہوتی۔ وہ ان پڑھ ہو سکتے ہیں، بزرگ یا بچے بھی ہو سکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو جانوروں کے کام، کاروبار سے بھی یہ فٹ پاتھی طالب علم علم حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ غیر رسمی لکچرر اپنے شاگردوں کو جینے کا فن سکھاتے ہیں۔

جو طالب علم جتنا تیز ہوا، وہ اتنی جلدی عملی علم برداری کر لیتا ہے۔ ساتھیوں کی وجہ سے طالب علم نگاہ بچا کر غلط کام کرنے، بہانا بنانے اور بچ نکلنے کا ہنر سیکھ جاتے ہیں۔ یہاں سکھایا بھی تو جاتا ہے کہ جو پکڑا گیا وہی چور۔ جو گرفت سے بچا وہ بنتا ہے گلیوں کا بے تاج بادشاہ۔

ان یونیورسٹیوں کی کلاس ویران کھنڈروں میں، گیراج کی دکانوں میں، سینما حال اور چائے پان کی گمٹیوں میں لگتی ہیں۔

''پریکٹیکل-ٹریننگ'' کے لیے شہر کے آوارہ موالی، گنجیڑی بھنگیڑی، دراچاری، بلاتکاری، نوجوانوں سے ہم آہنگی ضروری ہوتی ہے۔

بس ٹرک ڈرائیوروں اور خلاصیوں سے جغرافیہ، علم تمدن اور قانون کی پڑھائی آسانی سے ان کی سمجھ میں آجاتی ہے۔

موٹر گیراج میں کام سیکھ کر میکینکل انجینئرنگ اور آٹوموبائل انجینئرنگ کا کورس مکمل کیا جاتا ہے۔

درزیوں کی دکان میں بیٹھ کر ''ڈریس ڈیزائنر'' اور ''فیشن ٹیکنالوجی'' کی ڈگری مل جاتی ہے۔

نائی کی دکان سے ''بیوٹی پارلر'' کا ڈپلوما مل جاتا ہے۔

سول ٹھیکیدار کے پاس منشی گیری کر لینے کے بعد آدمی آسانی سے سول انجینئر جتنی قابلیت حاصل کر لیتا ہے۔

بجلی ٹھیکیدار کے پاس کام سیکھنے پر الیکٹریشن کا ڈپلوما ملا سمجھو۔

کارگزاری کے اصولی پہلوؤں سے وہ کم عمر ہی میں واقف ہو جاتے ہیں اور پریکٹیکل کا موقع متوسط طبقہ کے معاشروں میں انہیں بہ آسانی مل ہی جاتا ہے۔ چچا زاد، ماموں زاد بھائی بہن، چچا، ماما، پھوپھی، چاچی، مامی، نوکر، نوکرانی، باپ یا استاد، ان میں سے کوئی ایک یا زیادہ لوگ انہیں بلوغت کے تجربات سے معصوم بچپن ہی میں ماہر بنا دیتے ہیں۔

سیاست سیکھنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ آج کل ہر چیز میں ''سیاست'' کی بو آتی ہے۔

یونس اور اس کے جیسے تمام سہولتوں سے محروم بچے ایسی ہی یونیورسٹیوں کے طالب علم تھے۔

بڑے بھائی سلیم کی بے وقت موت سے غمزدہ یونس کو ایک دن اس کے آٹوموبال انجینئرنگ کے پروفیسر یعنی موٹر سائیکل مستری منو بھائی نے ''استادانہ حکمت'' کی زبان میں سمجھایا تھا۔ ''بیٹا، میں پڑھا لکھا تو نہیں لیکن ''لڑھا'' ضرور ہوں۔ اب تم پوچھو گے کہ یہ لڑھائی کیا ہوتی ہے تو سنو، ایم اے، بی اے جیسی ایک ڈگری اور ہوتی ہے جسے ہم ان پڑھ لوگ ''ایل۔ ایل۔ پی۔ پی۔'' کہتے ہیں۔ جس کا فل فارم ہوتا ہے، لکھ لوڑھا پڑھ پاتھر، سمجھے۔ اس ڈگری کی پڑھائی فرض ادائیگی کے مدرسے میں ہوتی ہے جہاں محنت کی کاپی اور لگن کے قلم سے ''لڑھائی'' کی جاتی ہے۔''

یونس منو بھائی کی حکمت بھری باتیں توجہ سے سنا کرتا۔

سہولتوں سے محروم بھرے بکھرے ہوئے گھریلو ماحول میں اسکولی تعلیم کی کسے فکر!

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اکیڈمک تعلیم اس کے بس کی بات نہیں۔

اسے بھی اب اس ''لڑھائی'' جیسی کوئی ڈگری بٹورنی ہوگی۔

اسی لیے وہ منو استاد کی بات گرہ میں باندھ کر رکھے ہوئے تھا۔

منو بھائی کی چھوٹی سی موٹر سائیکل ریپئر کا گیراج تھا۔

شہر کے باہر پہاڑی نالے کے پل کو پار کرتے ہی دو پہیا، تین پہیا، چار پہیا، چھ پہیا جیسی تمام گاڑیوں کی مرمت کے لیے گیراج ہیں۔ ٹائر میں ہوا بھرنے والے بہاری مسلمانوں کی دکانیں بھی ادھر ہی ہیں۔

منو بھائی کا گیراج پل پار کرتے ہی پہلے موڑ پر ہے۔

بنے استاد کے درزی گیری کے تجربے سے مایوس یونس کو گیراج کا ماحول ٹھیک لگا۔

گیراج کے اندر ایک لکڑی کا بورڈ تھا جس پر ترتیب سے پانہ، پیچ کس وغیرہ سجا کر ٹانگ دیے جاتے۔ یونس کا کام ہوتا، صبح منو بھائی کے گھر جا کر ان سے گیراج کی چابی لے آتا۔ بالشت بھر کی ایک جھاڑو تھی، جس سے وہ پہلے گیراج کے باہر صفائی کرتا۔ پھر گیراج کا شٹر اٹھاتا۔ اندر ریپئر کے لیے آئی سکوٹر موٹر سائیکل بے ترتیبی سے رکھی رہتیں۔ ایک ایک کر تمام گاڑیوں کو وہ گیراج سے باہر نکالتا۔ پھر گیراج کے اندر جھاڑو لگاتا۔ اس بیچ کوئی نٹ بولٹ، وائسر یا کوئی دیگر پارٹ گرا ہوا ملتا تو اسے اٹھا کر اپنی جگہ پر رکھ دیتا۔ منو بھائی کے آنے سے پہلے اگر کوئی گاہک آتا تو وہ اس کا مسئلہ سنتا اور اس کے لائق ریپئر کا کام ہوتا تو کر دیتا۔

اس چھوٹی موٹی ریپئرنگ سے اپنا جیب خرچ بناتا۔

رات گیراج بند ہونے سے پہلے وہ تمام پانہ پیچ کس کو جلے موبل سے دھوتا، پونچھتا اور پھر انہیں دیوار پر ٹنگے بورڈ پر لائن سے سجا دیتا۔

منو بھائی اور یونس مل کر مرمت کے لیے آئی تمام گاڑیوں کو گیراج کے اندر ٹھونستے۔

یونس جب گھر جانے کے لیے سلام کرتا تو منو بھائی اسے روکتے اور پھر کبھی دس، کبھی بیس روپے کا نوٹ پکڑا دیتے۔

اپنی اس چھوٹی موٹی کمائی سے یونس بہت خوش رہتا۔

ننھا یونس بڑا ذہین تھا......

کہا بھی جاتا ہے کہ یہ سکھڑے سردار اور ملیچھ مسلے بڑے ہنر مند ہوتے ہیں۔ تکنیکی کارکردگی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

محنت اور مرمت کے کام یہ کتنی صفائی سے کرتے ہیں۔ نائی، درزی اور سبزیوں کی دکانیں زیادہ تر مسلمانوں کی ہیں۔ انڈے، مرغا، مچھلی اور گوشت کی دکانوں پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہے۔

بابری مسجد گرائے جانے کے بعد شہر میں ہندو قصائیوں نے ''جھٹکا'' والی دکانیں لگائیں۔ حمید چیکوا بتاتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنی میٹنگ میں فیصلہ لیا ہے کہ ''فخر سے کہو ہم ہندو ہیں'' کا نعرہ لگانے والے قومی ہندو اگر گوشت خور ہیں تو وہ مسلمان چیکوا سے گوشت نہ خریدیں، بلکہ ''جھٹکا'' والی دکانوں سے گوشت خریدیں۔

اس سے مسلمانوں کے اس واحد کاروبار پر کچھ تو منفی اثر پڑے گا۔

سکھڑوں کو تو سن چوراسی میں اوقات بتا دی گئی تھی۔ مسلوں کو گودھرا کے بہانے گجرات میں تگڑا سبق سکھا دیا گیا۔

سکھ تو سمجھ گئے اور مین دھارے میں آ گئے، لیکن ان ملیچھ مسلمانوں کو یہ کانگریسی اور کمیونسٹ چنے کے جھاڑ پر چڑھائے رکھتے ہیں۔ اور وہ جو ایک ٹھولا لوآ ہے، وہ چارہ ڈکار کر مسلمانوں کا مسیحا بنا بیٹھا ہے۔

یونس نے کم عمر میں ہی جان لیا تھا کہ اس کے وجود کے ساتھ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔

چوک کے تلک دھاری منیم جی کہا کرتے -''اگر یہ ہمارے مجازی سیکولر نامرد ہندو چپ چاپ رہیں تو ''آر پار'' کی بات ہو ہی جائے۔ سیکولر کہتے ہیں یہ شکھنڈی سالے خود کو''

ان کے ہم خیال چوبے جی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے -''ہندو مفاد کی بات کرنے والے کو یہ چوتئے فرقہ واریت کہتے ہیں۔ ہمیں اچھوت سمجھتے ہیں۔''

شیشو مندر کے ہیڈ ماسٹر 'وشکر ماسر' کہاں چپ رہتے، ویسے بھی انہیں غرور تھا کہ وہ اس قصبے کے مقبول عام دانشور ہیں، لیکن سیاسی نظریات سے متاثر منیم جی اور چوبے جی انہیں زیادہ

اہمیت نہیں دیتے۔ ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنا ''ہوم لینڈ'' بنالیں۔ ان مسلوں کو دوسری شہریت ملے اور انہیں ووٹ دینے کے حق سے محروم کیا جائے۔ منھ بھرائی کی ساری سیاست خود بخود ختم ہو جائے گی۔''

اپنے وقت کے چیلنجوں سے باخبر اور بے خبر یونس، منو بھائی کو کام کرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھا کرتا۔

ان کے ہر اسٹائل کی نقل کیا کرتا۔

منو بھائی چائے بہت پیتے تھے۔

کوئی گاہک آیا نہیں کہ آڈر کر دیتے ہیں۔ ''یونس، تنی بھاگ کر چار ٹھو چائے لے آ۔''

وہیں یونس کو چائے کی عادت پڑی۔

منو بھائی کو ناسور ہو گیا تھا۔

سنتے ہیں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔

## سولہ

موٹر سائیکل مستری منو بھائی کے بعد اسے ایک اور استاد ملا۔ ''ڈاکٹر'' یہ کوئی ایم بی بی ایس یا جھولا چھاپ ڈاکٹر کا ذکر نہیں، بلکہ سردار شمشیر سنگھ ڈوجر آپریٹر کا قصہ ہے۔

سردار شمشیر سنگھ کہا کرتا۔ ''سر درد، کمر درد، بخار کی دوا لکھنے والا جب ڈاکٹر کہلاتا ہے تو تمام بیماریوں کو دور بھگانے والی دارو کا مشورہ دینے والے کو ڈاکٹر کیوں نہیں کہا جاتا؟''

دوسرے ڈاکٹر وہ ہوتے ہیں جو کسی خاص موضوع پر تحقیق کرتے ہیں اور یونیورسٹی سے انہیں 'ڈاکٹریٹ' کی ڈگری ملتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو یہ ڈگری مکمل مطالعہ کے بعد ملتی ہے اور کچھ لوگوں کو ان کی شاندار قابلیت کی وجہ سے یونیورسٹی خود ''ڈلٹ'' کی اعزازی ڈگری سے نوازا کرتی ہے۔

سردار شمشیر سنگھ کو دارو کے میدان میں مہارت حاصل تھی۔ اس لیے فٹ پاتھیا یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے انہیں اعزازی ''ڈاکٹریٹ'' کی ڈگری سے نوازا تھا۔ ڈاکٹر کی شاگردی میں یونس ''بلڈوزر'' اور ''پیلوڈور'' چلانا سیکھ گیا۔ ''پوکلین'' بھی وہ بہت اچھا چلاتا ہے۔

''پوکلین'' ہاتھی کی سونڈ کی طرح کی ایک کوئلہ کھودنے کی مشین ہے، جس کے ''بوم'' اور ''بکیٹ'' کا ''موومنٹ'' ٹھیک ہاتھی کے سونڈ کے جیسا ہے۔ جس طرح کوئی ہاتھی اپنی سونڈ کی مدد سے اونچے اونچے درختوں سے ہری بھری شاخیں توڑ کر اسی سونڈ کی مدد سے پتیاں اپنے منھ میں رکھتا ہے، اسی طرح سے ''پوکلین'' مشین کام کرتی ہے۔

شاید دنیا کے تکنیکی ماہرین، انجینئرز، چلانے والے اور معماروں نے قدرتی عناصر اور مخلوقات کی موجودگی سے تحریک حاصل کر کے اپنی مہارت اور کارکردگی میں اضافے کیے ہیں۔ کوئلہ کی کھلی کانوں اور زمین کی کایا کلپ کر دینے والے منصوبوں کی جان ہیں یہ بھاری بھرکم اوزار۔ چاہے بڑا سے بڑا پہاڑ کٹوا کر چٹیل میدان بنا دیں یا بڑی بڑی نہریں کھود ڈالیں۔

یونس کے ہنر کی سبھی تعریف کرتے۔ وہ ''ڈاکٹر'' کا شاگرد جو ٹھہرا!

''ڈاکٹر'' اب ریٹائر ہو چکا ہے۔

اپنے خالو کا یونس اسی لیے احسان مانا کرتا کہ انھوں نے ''ڈاکٹر'' سے اس کے لیے سفارش کی۔ ''ڈاکٹر'' کی وجہ سے ٹھیکیداروں میں آج اس کی اپنی ''مارکیٹ ویلیو'' ہے۔

خالہ نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ اپنی زندگی کو خود ایک نئے سانچے میں ڈھالے۔ اپنے بڑے بھائی سلیم کی طرح جلد بازی نہ کرے۔

جو بھی کام سیکھے پوری لگن اور ایمانداری کے ساتھ سیکھے۔ خالہ کہا کرتی تھی۔ ''سنو سب کی، لیکن کرو اپنے من کی۔'' دوسروں کے اشارے پر ناچنا بیوقوفی ہے۔

اسی لیے کام سیکھنے کے لیے یونس نے خالہ کی صلاح مانی۔

اس نے ''ڈاکٹر'' کی دارو یا دیگر عیب نہیں بلکہ اس کے ہنر کو اپنے اندر کر لیا۔ یہی یونس کا سرمایہ تھا۔

یونس نے کوئی کثر نہ چھوڑی کام سیکھنے میں۔

''ڈاکٹر'' کو قبول کرنا پڑا کہ اس نے آج تک اتنے شاگرد بنائے لیکن اس ''کٹوے'' جیسا ایک بھی نہیں۔ بہت سے شاگرد بنے، جنہوں نے اس سے شراب پینی سیکھی۔ نشے میں دھت رہنا سیکھا۔ رنڈی بازی سیکھی لیکن کام نہ سیکھا۔

اسی لیے یونس کو وہ کہا کرتا۔ ''یہ بڑا لائق شاگرد نکلا۔'' یونس کو اب بھی درد ہوتا ہے، جاڑے کی ان کڑکڑاتی اندھیری راتوں کو یاد کر کے۔ جب کوئلے کی اوپن کاسٹ کان کے ''ڈمپنگ ایریا'' میں وہ ڈاکٹر کے ساتھ کام سیکھنے جایا کرتا تھا۔

سنگرولی علاقے میں کوئلے کی بڑی بڑی کھلی کانیں ہیں۔

مدھیہ پردیش اور اتر پردیش کی سرحد پر کوئلے کا بے شمار بھنڈار ہے سنگرولی میدان میں۔ رہند ندی پر باندھا گیا بڑا سا باندھ۔ کوئلہ اور پانی کے ملانے سے بجلی بنانے کے بڑے بڑے بجلی گھر۔ لاکھوں ٹن کوئلے سے بننے والی ہزاروں میگاواٹ بجلی۔ اس بجلی کی نیشنلائز تکمیل میں سنگرولی علاقے کی کافی حصہ داری ہے۔

سنگرولی علاقہ میں ملک کا ایک اہم بجلی گھر ہے۔

ایک بار میں ایک سو بیس ٹن کوئلہ اٹھا کر چلنے والے بھاری بھرکم ڈمپر۔ سینکڑوں ٹن بارود کی بلاسٹنگ سے چور چور پتھر کا پہاڑ اپنی پیٹھ پر اٹھائے، الممست ہاتھی کی طرح جھوم جھوم کر چلتے ڈمپر۔ ان ڈمپروں کے چلنے سے ایسا شور ہوتا جیسے سینکڑوں شیر دہاڑ رہے ہوں۔ ایک ایک ڈمپر ایک بڑی فیکٹری کے برابر ہے۔

ڈمپر کے چلنے کے لیے چوڑی سڑکیں بنائی جاتی ہیں۔ انہیں حال روڈ کہا جاتا ہے۔ حال روڈ پر ڈمپر چلنے سے پہلے پانی کے ٹینکر سے سینچائی کی جاتی ہے تاکہ دھول کے بادل نہ اٹھیں۔ بالوئی پتھر کی دھول پھیپھڑوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ پھیپھڑوں کے سوراخوں میں کوئلے اور پتھر کی دھول کے ادخال سے کان مزدوروں کو ''نیوموکونیوسس، سلکوسس'' جیسی بیماریاں ہوجاتی ہیں۔

سنگرولی علاقے کی کوئلہ کانوں میں بڑی بڑی ڈریگ لائنیں ہیں۔ زمین کی سطح سے ڈیڑھ سو فٹ تک گہرائی سے مٹی کھود کر تین سو فٹ کے فاصلے پر لے جا کر ''ڈمپ'' کرنے والا آلہ ''ڈریگ لائن'' یونس بڑے شوق سے اس بھاری بھرکم مشین کو چلتے ہوئے دیکھا کرتا، ایک دم ڈوب کر۔ رسیوں کے سہارے ''بکیٹ'' کا آپریشن۔ لمبے لمبے ''بوم'' پر گھریوں کے سہارے رسیوں کا حیرت انگیز کھیل۔ ''ڈاکٹر'' عرف شمشیر سنگھ ایک دن یونس کو ڈریگ لائن دکھانے لے گئے۔ قریب جانے پہ اسے ڈر لگا تھا۔ رات کا وقت۔ سینکڑوں بلب کی روشنی سے ڈریگ لائن کا چپا چپا چمک رہا تھا۔ اتنی روشنی کہ آنکھیں چندھیا جائیں۔ اتنے بلب کہ شمار نہ کیا جا سکے۔ مارچنگ پیڈ سے لے کر بوم کے ٹاپ تک تیز روشنی کی سرچ لائٹیں۔ ''ڈاکٹر'' اسے ایک جیپ میں بٹھا کر ڈریگ لائن تک لے گیا تھا۔ جیپ پانچ سو میٹر کے فاصلے پر روک دی گئی۔ وہاں سے اب پیدل جانا تھا۔ اتنی بڑی ڈریگ لائن کے سامنے انسان کتنا بونا نظر آتا ہے۔ ہاتھی کے قریب چیونٹی کی سی حیثیت۔ ڈریگ لائن ایک گھنٹے میں ایک ہزار مزدوروں کے ایک ماہ کام کے برابر مٹی ہٹاتی ہے۔ اسے محض ایک آدمی چلاتا ہے۔ ڈریگ لائن آپریٹر۔ جس کی تنخواہ کان کے تمام مزدوروں سے زیادہ ہوتی ہے۔

ڈریگ لائن کے پیچھے دو ڈوجر مسلسل چل رہے تھے۔ وہ ڈریگ لائن کی اگلی ''سیٹنگ'' کے لیے برابر جگہ بنا رہے تھے۔

ڈاکٹر نے یونس سے کہا کہ گھومتی ہوئی ڈریگ لائن میں چڑھنا ہوگا۔ ڈریگ لائن کا

مارچنگ پیڈ ہی زمین سے بیس فٹ اونچا تھا۔ اس پر سیڑھی لگی تھی۔ ڈاکٹر اچک کر اس سیڑھی پر چڑھ گیا اور جلدی جلدی اوپر چڑھنے لگا۔ یونس نے بھی اس کی پیروی کی۔ اب وہ مارچنگ پیڈ پر تھے۔ ڈریگ لائن اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے گھوم گھوم کر مٹی اٹھا کر پھینک رہا تھا۔ پھر ڈاکٹر پچاس فٹ اونچے مشین روم کی طرف جانے والی سیڑھی پر چڑھنے لگا۔ یونس بھی پیچھے پیچھے چڑھ گیا۔ مشین روم سے گرم ہوا نکل رہی تھی، جس سے اب سردی لگنی کم ہو گئی تھی۔ مشین روم کا دروازہ بند تھا۔ ڈاکٹر نے دھکا مار کر دروازہ کھولا تو آلات کے چلنے سے پیدا ہوئے خوفناک شور سے لگا کہ کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔ یونس نے کان ہاتھوں سے بند کر لیے۔ مشین روم میں بڑے بڑے موٹر، جنریٹر اور جانے کتنے اوزار لگے تھے۔ جن کے چلنے سے وہاں شور تھا۔

ڈاکٹر یونس کو ڈریگ لائن کے کام کرنے کے طریقہ کے بارے میں بتانے لگا۔ ڈمپ روپ گھمانے کے لیے ڈرم لگا ہوا ہے۔ ڈریگ روپ گھمانے کے لیے ڈرم کدھر ہے۔ یونس نے دیکھا کہ آٹھ دس فیکٹریوں کے برابر ڈریگ لائن میں موٹر جنریٹر لگے ہیں۔

پھر وہ لوگ آپریٹر کیبن کی طرف گئے۔ دروازہ کھولنے پر ایک ''کاری ڈار'' ملا، جس پر قالین بچھا ہوا تھا۔ یہاں ٹکنیشین آرام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے یہاں اپنا جوتا اتارا۔ یونس نے بھی جوتے اتارے۔ پھر ایک شیشے کا دروازہ کھول کر وہ آپریٹر کیبن میں جا پہنچے۔ ایک دم ٹھنڈا کمرا۔ کانچ کا گھر۔ پیچھے کی طرف وائرلیس سیٹ۔ درمیان میں آپریٹر کی سیٹ۔ جس پر ایک سردار جی آرام سے بیٹھ کر ہاتھ اور پاؤں کی مدد سے ڈریگ لائن چلا رہے تھے۔ یونس کو لے کر ڈاکٹر سامنے کی طرف آ گیا۔ یہاں سے نیچے کوئلے کی پرت دکھائی دے رہی تھی۔ جس کے اوپر کے ''اوور برڈن'' کو ڈریگ لائن کی بکیٹ سے اٹھا کر سردار جی تین سو فٹ دور کنارے ڈال رہے تھے۔ اس سے پھینکی ہوئی مٹی کا ایک نیا پہاڑ بنتا جا رہا تھا۔ بڑی سر تال طریقے کے کام تھے ڈریگ لائن کے۔

ڈریگ لائن آپریٹر کے سامنے اور دونوں طرف جانے کتنے لیور، بٹن اور سگنلنگ لائٹس لگے ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں سردار جی کنٹرول روم سے وائرلیس کے ذریعے بات کرتے جاتے تھے۔ پھر سردار جی نے ڈاکٹر کی فرمائش پر اسسٹنٹ سے کہا کہ ڈاکٹر کو ''پاگڑا'' سنوا دے یارا!

یونس نے اس دن وہاں چائے بھی پی۔ آپریٹر کے رہنے سہنے کا وہاں مکمل انتظام تھا۔

اگر وہ تھک جائے یا اسے حاجت لگی ہو تو اسسٹنٹ موجود رہتا جو ڈریگ لائن آپریشن جاری رکھتا۔

ایسی ہی ایک اور حیرت انگیز مشین ہے ''ڈرلنگ مشین۔'' یہ زمین میں ایک سو پچاس فٹ گہری اور ایک فٹ چوڑا سوراخ کرتی ہے جن میں ڈیڑھ سے دوٹن بارود ڈال کر بلاسٹ کیا جاتا ہے۔ایک بار میں چار پانچ سوٹن بارود کی بلاسٹینگ ہوتی ہے۔آس پاس کا علاقہ دہل جاتا ہے۔دھول اور رنگ برنگی گیسوں کے بادل کافی دیر تک چھائے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سنگرولی علاقے میں کان کھلنے سے پہلے ہر طرح کے جنگلی جانور رہا کرتے تھے۔ یہ ایک محفوظ پناہ گاہ کی طرح تھا۔کان کھلنے سے جنگلات کم ہوئے۔شہر آباد ہو گئے۔جانور جانے کہاں غائب ہو گئے۔ آج بھی سیار، مور، لومڑی اور بن مرغیاں یہاں نظر آتے ہیں۔کئی لوگ شیر وغیرہ دیکھنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔

زمین کے پیٹ میں صدیوں سے چھپی ہیں کوئلے کی موٹی پرتیں۔

کوئلے کی پرت کے اوپر سخت بالوئی پرت دار تلچھٹ چٹانیں ہیں۔

یونس نے ''اوور مین مکھرجی دا'' سے ایک بار پوچھا تھا کہ دادا، یہ کوئلہ بنا کس طرح؟

بنگلہ دیش سے رانچی آکر آباد مکھرجی دا کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔وہ کچھ بھی کہیں، ''ہت شcompleted شالا'' کہے بغیر اپنی بات پوری نہ کرتے۔

انہوں نے بتایا کہ کروڑوں سال پہلے یہاں گھنے جنگل ہوا کرتے تھے۔ پھر بہت بڑا اسیلاب آیا ہوگا اور وہ سارے جنگلات پانی میں ڈوب گئے ہوں گے۔ پیڑ پودے، جنگلات وغیرہ سڑگل کر نامیاتی مادہ میں تبدیل ہو گئے ہوں گے۔ بعد میں ان پر ریت مٹی کی پرتیں جمتی چلی گئیں۔آہستہ آہستہ تیز دھوپ اور دباؤ سہتے سہتے جنگلات کوئلے میں تبدیل گئے ہوں گے۔اسی لیے اب بھی ان کوئلے کی تہوں میں درختوں کے پھانس یعنی جیواشم پائے جاتے ہیں۔

کوئلہ کہیں کہیں زمین کی سطح کے کافی نیچے ملتا ہے۔اس کی کوالٹی اچھی ہوتی ہے۔اس کوئلے کو نکالنے کے لیے سرنگیں بنائی جاتی ہیں یا چانک کھودے جاتے ہیں۔ایسی کانوں کو ''انڈر گراونڈ'' کانیں کہا جاتا ہے۔

جن مقامات میں کوئلے کی پرت زمین کی سطح سے تھوڑا بہت نیچے ملتی ہے، ان کوئلے کی تہوں کی کان کنی ''اوپن کاسٹ'' طریقہ کار سے کی جاتی ہے۔ایسی کانیں ''اوپن کاسٹ مائن''

یا ''کھلی کانیں'' کہلاتی ہیں۔

بلاسٹنگ کے بعد چور ہوئی چٹانوں کو ''شاویل'' جیسے کھدائی آلات سے کھود کر ڈمپروں پر لاد دیتے ہیں۔ ان چٹانوں کے پاؤڈر کو کان کنی اصطلاح میں ''اوور برڈن'' کہا جاتا ہے۔ اوور برڈن کو ڈمپروں کے ذریعے ڈمپنگ ایریا میں بھیجا جاتا ہے۔ ''ڈمپنگ ایریا'' میں اوور برڈن ڈمپ ہوتے ہوتے ایک پہاڑ جیسا بن جاتا ہے۔

صدیوں پرانے پہاڑ کٹکر اوور برڈن کے نئے پہاڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اوور برڈن کے پہاڑ انسان کے ہاتھ کی تحریر ہیں۔ ان نئے پہاڑوں کی چوٹیوں کو ہموار کر کے ان پر پیڑ لگایا جاتا ہے۔

کوئلہ نکل جانے کے بعد باقی بچے گڑھے کو مصنوعی جھیل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اسی ڈمپنگ ایریا میں بلڈوزر چلا کرتے ہیں جو ڈمپر کے ذریعے لائی گئی چٹانوں کو ''ڈوج'' کر کے برابر بنایا جاتا ہے، تا کہ ان پر دوبارہ ڈمپر آ کر اوور برڈن کی ڈمپنگ کر سکیں۔

یونس اسی بلڈوزر کی آپریٹری سیکھنے کان آیا کرتا۔

ڈمپنگ ایریا میں شیر کی طرح دہاڑتے ڈمپر آتے تو ان کو دیکھ کر کلیجہ دہل جاتا۔ ڈمپر آپریٹر جب ریورس گیئر لگاتا تو اس کا آڈیو اور تصویری الارم بجنے لگتا - پی...... پاں...... پی...... پاک......

ڈمپر پیچھے چل کر بلڈوزر سے بنائی گئی مینڈ پر آ کر رکتا۔ پھر ڈمپر آپریٹر ''ڈمپ لیور'' اٹھاتا اور اوور برڈن کا ڈھیر بھر بھرا کر سینکڑوں فٹ نیچے گہرائی میں گرا دیتا۔ کچھ مال مینڈ پر بچ جاتا جسے ڈوجر آپریٹر، ڈوجر کی مدد سے صاف کرتا، تا کہ اگلا ڈمپر اس جگہ پر آ کر محفوظ ''انلوڈ'' کر سکے۔

ڈمپنگ علاقے میں کنارے کی مینڈ بنانا ہی اصلی ہنر کا کام ہے۔ اس مینڈ کو ''برم'' کہا جاتا ہے۔ اگر یہ برم کمزور بنے تو ڈمپر کے بے قابو ہو کر نیچے لڑھکنے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔ غیر محفوظ ڈمپنگ سے علاقے میں کئی حادثے ہو چکے ہیں۔

اس سے کروڑوں روپے کے خرچ سے درآمد ڈمپر گر کر تباہ ہوتے ہیں اور کئی بار آپریٹر کی جان بھی جاتی ہے۔ بلڈوزر سے ''ڈوجنگ'' کرنا ایک طرح کا فن ہے۔ جس طرح مورتی بنانے والا چھینی ہتھوڑی سے بے جان پتھروں میں جان پھونکتا ہے، اسی طرح موثر ڈوجر آپریٹر،

ڈوجر کی بلیڈ کے فنکارانہ استعمال سے اوبڑ کھابڑ راستے کی صورت بدل دیتا ہے۔

یونس اپنی بے مثال محنت اور لگن سے جلد ہی اس ہنر میں ماہر ہو گیا۔

اس سے اس کے شرابی استاد ''ڈاکٹر'' کا بھی فائدہ ہوا۔

سیکنڈ شفٹ کی ڈیوٹی میں شام ہوتے ہی یونس کو بلڈوزر پکڑا کر ''ڈاکٹر'' دارو کی بھٹی پہ چلا جاتا۔

کوئلے کی کان کے مزدوروں اور کچھ افسروں کے ذہن میں یہ تصور ہے کہ دارو شراب پھیپھڑوں میں منجمد کوئلے کی دھول کو کاٹ پھینکتی ہے۔ ساتھ ہی ایک نعرہ اور گونجتا کہ دارو کے بغیر کان کا مزدور زندہ نہیں رہ سکتا۔

اسی لیے کوئلے کی کان کے علاقے میں دارو کے اڈے کثرت سے ملتے ہیں۔

لوگ کہتے کہ مرنے کے بعد کوئلے کی کان کے مزدوروں کو جلانے میں لکڑی کم لگے گی، کیونکہ ان کے پھیپھڑوں میں ویسے بھی کوئلے کی دھول جمی ہوگی جو خود بخود جلے گی۔

مکھر جی دا کہتے۔ ''یہ آدمی بھی ششالا گڈ کوالٹی کا کوئلہ ہوتا ہے۔''

یونس نے کبھی دارو نہیں پی۔

ہوسکتا ہے اس کے پیچھے خالہ خالو کا ڈر ہو، یا دماغ میں بیٹھی بات کہ مسلمانوں کے لیے شراب حرام ہے۔ ٹھیک اسی طرح یونس بغیر تصدیق کے باہر گوشت نہیں کھاتا۔ اس بات کا یقینی اعتماد ہونا چاہئے کہ گوشت حلال ہے، جھٹکا نہیں۔ دوستوں کے ساتھ پارٹی وارٹی میں وہ مچھلی کا پروگرام بناتا یا پھر سبزی کھاتا۔

اوپن کاسٹ کوئلے کی کان کی بھاری مشینوں کو چلانا سیکھنے کے بعد اس میں اعتماد جاگا۔

سرکاری نوکری تو ملنے سے رہی، ہاں اب وہ بڑی آسانی سے کسی پرائیویٹ نوکری میں تین چار ہزار روپے مہینے کا آدمی بن گیا تھا۔

خالو نے یونس کے لیے کوئلہ پریوہن کرنے والی کمپنی ''مہتا کول ایجنسی'' یعنی ''ایم سی اے'' کے منیجر سے بات کی۔

منیجر نے جواب دیا کہ جگہ خالی ہونے پر غور کیا جائے گا۔

خالو جان گئے کہ پرائیویٹ میں بھی ہنر کی بدولت کام کی جگاڑ کر پانا ان کے بس کی

بات نہیں، اس وجہ سے وہ ہار مان گئے۔

لیکن خالہ کہاں ہار ماننے والی تھیں۔

مزدور یونین کے رہنما چوبے جی سے خالہ کی اچھی بول چال تھی۔ چوبے جی ان کے میکے والے گاؤں کے تھے۔ کالونی میں اس طرح کے تعلقات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

خالہ کی دعوت پر چوبے جی ایک دن کواٹر آئے تو یونس دوڑ کر ان کے لیے دو بیڑا پان لے آیا۔ پان چباتے ہوئے چوبے جی نے کہا تھا-''سویرے دس بجے مہتوا کے آفس پر لڑکوا کو بھیج دیں۔ آگے جون ہوئی تو ن ٹھیکیہ ہوئی۔''

اور واقعی، چوبے جی کی بات پر اسے عارضی طور پر کام مل گیا۔

''مستقل'' کام کے بارے میں چوبے جی کو یقین دلایا گیا کہ کام دیکھ کر جلد ہی بچے کو مستقل کر دیا جائے گا۔

ایک بات ضرور یونس کو سنا دی گئی کہ کمپنی اپنی ضرورت کے مطابق، کام پڑنے پر اپنے ملازمین کو ملک کے کسی بھی حصے میں کام کرنے بھیج سکتی ہے۔ ایم۔ سی۔ اے۔ کا کاروبار بہار، بنگال، جھارکھنڈ، مدھیہ پردیس اور چھتیس گڑھ تک پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے کسی بھی صوبے میں انہیں بھیجا جا سکتا ہے۔

مرتا کیا نہ کرتا، یونس نے تمام شرطیں مان لیں۔

اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

بھاری بھرکم سرکاری ڈمپروں میں لد کر کوئلہ ''کول یارڈ'' تک پہنچ جاتا۔

وہاں ان میں سے شیل، پتھر وغیرہ کو چھانٹا جاتا ہے۔ کول یارڈ کو پہلی نگاہ میں کوئی باہری آدمی کوئلے کی کان ہی سمجھے گا۔ سینکڑوں ایکڑ میں پھیلے وسیع میدان میں کوئلے کے ٹیلے۔ انہیں اب پرائیویٹ دس ٹن والے ڈمپروں میں بھر کر ریلوے سائڈنگ تک پہنچانے کا کام ایم۔ سی۔ اے۔ کا تھا۔ ان دس ٹن والے ڈمپروں سے براہ راست گاہکوں تک بھی کوئلہ پہنچایا جاتا۔

کوئلہ یارڈ میں پیلوڈر مشین سے دس ٹن والے ڈمپروں میں کوئلہ بھرا کرتا تھا یونس۔ اس کی کارکردگی، ایمانداری، محنت اور نرم رویے کی وجہ سے منشی منیجر اسے بہت مانتے تھے۔ کوئی اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

نہ جانے کیوں ایسے حالات بنے کہ اسے خالہ کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ لینا پڑ گیا۔

ویسے بھی اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دانا پانی اب اٹھا ہی سمجھو۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بڑے بھائی سلیم کی طرح غیر ہنر مند کارکنوں کے زمرے میں اس کی گنتی نہیں تھی۔ اس کی ایک ''مارکیٹ ویلیو'' بن چکی ہے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے وہ ڈھیر سارا کھو بھی رہا ہے۔ یعنی تپتی چلچلاتی دھوپ میں گھنی آم کی چھاؤں جیسی اپنی صنوبر کو...

وہ صنوبر سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا تھا۔

فلم ''مقدر کا سکندر'' کا ایک مشہور گانا وہ اکثر گنگنایا کرتا - ''او ساتھی رے، تیرے بنا بھی کیا جینا۔'' بگ بی امیتابھ کی طرز پر اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے- ''صنوبر کے بنا جینا بھی کوئی جینا ہے للو، ایں......''

کیا اب وہ صنوبر سے کبھی مل پائے گا؟

یونس جانتا ہے کہ وہ صنوبر کے لائق نہیں۔

مخمل میں ٹاٹ کا پیوند، یہی تو خالہ نے اس کے بارے میں کہا تھا۔

خالہ جانتی تھی کہ وہ صنوبر کو چاہتا ہے۔ صنوبر بھی اسے پسند کرتی ہے، لیکن صرف ایک دوسرے کو چاہ لینے سے کوئی کسی کی زندگی کا مالک تو بن نہیں سکتا۔

یونس کے پاس صنوبر کو خوش رکھنے کے لیے ضروری وسائل کہاں؟

''مانا کہ دہلی میں رہو گے، کھاؤ گے کیا غالب؟''

اب صنوبر اس کی کبھی نہ ہو پائے گی!

دنیا میں کچھ انسان خوش قسمتی سے جنت کی خوشی پاتے ہیں اور کچھ انسانوں کے چھوٹے چھوٹے خواب، حقیر سی چاہت بھی مکمل نہیں ہو پاتی ہیں... کیوں؟

ایسے ہی کتنے سوالوں سے جوجھتا رہا یونس...

☆☆

## سترہ

پلیٹ فارم کے مین دروازے پر ایک لڑکی نظر آئی۔
یونس چونک اٹھا۔
کہیں یہ صنوبر تو نہیں۔
ویسا ہی پتلا دبلا جسم۔
اس لڑکی کے پیچھے ایک موٹا آدمی اور ٹھگنی عورت تھی، جو شاید اس کے ماں باپ ہوں۔
وہ فرسٹ کلاس انتظار گاہ کی طرف جا رہے تھے۔
یونس صنوبر کو بڑی شدت سے یاد کرنے لگا۔
اسے یاد آنے لگیں وہ سب باتیں، جن سے پر سکون زندگی میں ہلچل مچی۔
جمال صاحب کا خالہ کے گھر میں اثر بڑھتا گیا۔ ہر ایک معاملات میں ان کی دخل اندازی ہونے لگی۔
رمضان المبارک کے مہینے میں وہ رات کو خالہ کے گھر میں ہی رکنے لگے۔ رمضان میں صبح سورج نکلنے سے پہلے کچھ کھانا پڑتا ہے، جسے سحری کرنا کہتے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس میں کہاں تازی روٹی رات کے دو تین بجے بنتی۔ اس لیے خالہ کے فضل سے یہ جمال صاحب شام کو جو گھر آتے تو پھر صبح فجر کی نماز کے بعد ہی واپس گیسٹ ہاؤس جاتے۔
عید میں وہ ناگ پور جاتے، لیکن خالہ اور خالو کی ضد کی وجہ سے وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے پاس نہیں جا پائے۔
جانے کیسا جادو کر رکھا تھا خالہ نے ان پر...
اصل وجہ تو یونس کو بعد میں پتہ چلی۔

ہوا یہ کہ اس درمیان ایک ایسی بات ہوئی کہ یونس کو خالہ کے گھر اپنی اوقات کا اندازہ ہوا۔
اس دن اس نے جانا کہ اگر یہاں رہنا ہے تو ذلیل ہو کر رہنا ہوگا۔
اس نے جانا کہ بھروسہ کیا چیز ہوتا ہے؟
اس نے جانا کہ غربت انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔
اس نے جانا کہ کسی کے بھروسے رہ کر جینے سے اچھا ہے مر جانا ہے۔
اور اسی وقت اس کے دل میں اپنے پروں کے بھروسے اپنے آسمان میں اڑنے کی خواہش جاگی۔

ہوا یہ کہ صنوبر نے یونس کے کپڑے بغیر دھوئے یوں ہی پھینچ پھانچ کر سکھا دیے تھے۔ کپڑوں میں صابن لگایا ہی نہیں تھا۔
گریس تیل اور پسینے کی بدبو کپڑے میں سمائی ہوئی تھی۔
یونس کا پارہ ساتویں آسمان میں چڑھ گیا۔
اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، صنوبر کی پٹائی کر دی۔
صنوبر چیخ چیخ کر روتی رہی۔
خالہ نے یونس کو جاہل، گنوار، کھبیس، راکس، پیٹو، احسان فراموش اور بھگوڑے وغیرہ جانے کتنے خطابوں سے نوازا۔

یونس اس دن ڈیوٹی گیا تو پھر گھر لوٹ کر نہ آیا۔ اس نے کلو کے گھر رہنے کی ٹھان لی تھی۔ جیسے دوسرے لڑکے زندگی گزار رہے ہیں، ویسے وہ بھی رہ لے گا۔ خالہ کے گھر میں ہوئی بےعزتی سے اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔

دوسرے دن جب وہ گھر نہ لوٹا تو خالو خود ایم۔ سی۔ اے۔ کی ورکشاپ میں آئے۔ انہوں نے یونس کو گھور کر دیکھا۔
پھر پوچھا۔ ''گھر کاہے نہیں آتا بے!''
یونس خالو سے بہت ڈرتا تھا۔
اس کی روح کانپ گئی۔
اس نے کہا۔ ''اوور ٹائم کر رہا تھا۔ آج آؤں گا۔''

خالو متاثر ہوئے۔

اس کی جان بچی۔

شام ڈیوٹی سے چھوٹنے پر اس نے منوہرا کے ہوٹل سے گرما گرم سموسے خریدے۔ ساتھ میں املی کی کھٹی میٹھی چٹنی رکھوائی۔ صنوبر کو سموسے بہت پسند ہیں۔

واقعی، اسے کسی نے کچھ نہ کہا۔

سب نے دل لگا کر سموسے کھائے۔

خالہ کے کہنے پر صنوبر نے دو سموسے اپنے جمال انکل کے لیے رکھ دیے۔

اس رات سب نے لوڈو کھیلی۔

جمال انکل، خالہ، صنوبر اور یونس۔

یونس کے بغل صنوبر تھی اور اس کے بغل جمال انکل۔ ٹی ٹیبل کے چاروں طرف بیٹھے تھے وہ۔

یونس نے کھیل کے درمیان محسوس کیا کہ میز کے نیچے ایک دوسرا کھیل جاری ہے۔ جمال انکل کے پاؤں صنوبر کے پاؤں سے بار بار ٹکراتے ہیں۔ ایسے رابطے کے دوران دونوں بات بے بات خوب ہنستے ہیں۔

اس کے پلٹے ہوئے گلابی ہونٹ جب ہنسنے ہیں تو یونس کو دیوانہ بنا جاتے تھے، لیکن آج اسے وہ ہونٹ کسی ڈائن کے خون میں رنگے ہونٹوں کی طرح نظر آئے۔

اسے صنوبر کی بے وفائی پر بڑا غصہ آیا۔

اس رات خالو کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔

خالو کھانا کھا کر ڈیوٹی چلے گئے۔

جمال صاحب بھی جانا چاہتے تھے کہ ٹی وی پر غلام علی کی غزلوں کا پروگرام آنے لگا۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

مرکیوں والی کھنک دار آواز میں غلام علی اپنے سروں کا جادو بکھیر رہے تھے۔ یونس بھی غلام علی کو پسند کرتا تھا، لیکن جمال صاحب کی دلچسپی جان کر اسے جانے کیوں غلام علی کی آواز نک

نکاتی سی لگی۔آواز ایسے لگی جیسے پان کی سپاری گلے میں پھنسی ہوئی ہو۔

جیسے سردی سے ناک جام ہو۔

وہ ٹی وی کے سامنے سے ہٹ گیا۔

اندر باورچی خانے میں اس کا بستر بچھتا تھا۔

چٹائی کے ساتھ گدڑی لپٹی رہتی۔صبح چٹائی لپیٹ دی جاتی اور رات میں وہ سونے سے پہلے چٹائی بچھا لیتا۔اوڑھنے کے لیے ایک چادر تھی۔تکیہ وہ لگاتا نہ تھا۔

باورچی خانے کی روشنی بند ہوتی تب بھی باہر آنگن کی روشنی کھڑکی سے چھن کر رسوئی میں آتی۔اسے اس دھندلی روشنی میں سونے کی عادت تھی۔

ٹی وی والے کمرے میں قہقہے گونج رہے تھے۔

یونس کے کان میں کچھ افواہیں پڑ چکی تھیں کہ جمال صاحب بڑا شیطانی آدمی ہے۔ ناگپور میں ''ڈونیشن'' والے انجینئرنگ کالج سے پڑھ کر نکلا ہے جمال صاحب۔ سنتے ہیں کہ وہاں وہ غنڈہ تھا غنڈہ۔

اس کی خوب چلتی تھی وہاں۔

باہری لڑکوں سے مہینہ وصولی کرتا تھا جمال صاحب۔

خالو نے اسے گھر میں گھسا کر اچھا نہیں کیا۔

ایک کے منھ سے یونس نے سنا کہ جمال صاحب کی نظر کھلی بوری اور بند بوری کی شکر، دونوں پر ہے۔

کھلی بوری اور بند بوری کی بات یونس سمجھ سکتا تھا، کیونکہ فٹ پاتھی یونیورسٹی کے کورس کے محاورے میں یہ بھی تھا۔

کھلی بوری یعنی خالہ اور بند بوری یعنی صنوبر!

یونس کو نیند نہیں آ رہی تھی۔

غلام علی کی آواز کسی تیز چھری کی طرح اس کی گردن ریت رہی تھی۔

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

وفا کریں گے نبھائیں گے بات مانیں گے
تمہیں بھی یاد ہے کہ یہ کلام کس کا تھا

سنوبر کی کھلکھلاہٹ سن کر یونس کا دل رو رہا تھا۔
اس نے کروٹ لے کر اپنے کان کو کہنی سے دبا لیا۔
آواز مدھم ہو گئی۔
نیند لانے کے لیے کلمے کا ورد کرنے لگا۔
''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ''
پتہ نہیں اسے نیند آئی یا نہیں، لیکن رات اچانک اسے اپنا پاجاما گیلا لگا۔
ہاتھ سے ٹٹولا تو گیلی چپ چپی ہو گئیں انگلیاں، یعنی............
اس کا دماغ خراب ہو گیا۔
نیند اچٹ گئی۔
پیشاب کا دباؤ مسانے پر تھا۔
وہ اٹھا۔
کھڑکی کے پلوں سے چھن کر پیلے رنگ کی روشنی کے دھبے کمرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ٹھیک اس کے پاجامے میں اتر آئے دھبوں کی طرح۔
اسے کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی۔ جانے کیوں خواب میں ہوئے انزال کے بعد اس کی حالت پست ہو جاتی ہے۔
اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔
وہ کچھ پل بیٹھا رہا۔
تبھی اس کے کان کھڑے ہوئے۔
پہلے کمرے سے پھسپھسانے کی آواز آ رہی تھی۔ تخت بھی ہولے ہولے چرمرا رہا تھا۔
یونس نے باورچی خانے سے لگے بچوں کے کمرے میں جھانکا۔ وہاں صنوبر اپنے دوسرے بھائی بہنوں کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔

اس کا مطلب پہلے کمرے میں خالہ ہیں۔ پھر ان کے ساتھ کون ہے؟ خالو کی تو نائٹ ڈیوٹی ہے۔

یونس کے ذہن میں تجسس کے ساتھ خوف بھی پیدا ہوا۔

وہ دبے پاؤں پہلے کمرے کے دروازے کی جھریوں سے اندر جھانکنے لگا۔

پہلے کمرے میں بھی اندھیرا ہی تھا۔

ہاں، روشندان کے ذریعے سڑک کے ستون سے روشنی کا ایک بڑا ٹکڑا سیدھے دیوار پر آچپکا تھا۔

اندھیرے کا عادی اس نے تخت پر نگاہیں ٹکائی۔

دیکھا خالہ کے ساتھ جمال صاحب قابل اعتراض حالت میں ہیں۔

اس کی ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔

اس کا گلا سوکھ گیا۔

ہاتھ میں جنبش ہونے لگی۔

دل کی دھڑکنیں تیز کیا ہوئیں کہ اس کا ذہنی توازن گڑبڑا گیا۔

اسی میں اس نے وہاں سے بھاگنا چاہا کہ اس کے پاؤں کی آہٹ سن کر خالہ کی دبی سی چیخ نکلی۔

یونس فوراً اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔

پہلے کمرے کی سرگرمی میں رکاوٹ پیدا ہو چکی تھی۔ وہاں سے آنے والی آہٹیں بڑھیں۔ پھر باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر اسکوٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور لگا کہ پھر سے اڑ گئی ہوا اسکوٹر۔

یونس کو کاٹو تو خون نہیں۔

آنکھیں بند کیے، کروٹ بدلے وہ اب خالہ کی حرکتوں کا اندازہ لگانے لگا۔

لگتا ہے خالہ نے پہلے بچوں کے کمرے کی لائٹ جلا کر وہاں کا جائزہ لیا ہے۔

اب وہ باورچی خانے کی طرف آرہی ہیں۔

لائٹ جلا کر یہاں بھی وہ یونس کے پاس کچھ دیر کھڑی رہیں۔

ان کا شیطانی دماغ ماجرا سمجھنا چاہ رہا تھا۔

پھر وہ دوبارہ پہلے کمرے میں چلی گئیں۔

یونس کی جان میں جان آئی۔

وہ اسی طرح پڑا رہا جبکہ پیشاب کے زور سے مسانے پھٹنے کو تھے۔

جمال صاحب اور خالہ کی حقیقت، صنوبر کا جمال صاحب کی طرف جھکاؤ اور صنوبر کے ساتھ جمال صاحب کے رشتے کو لے کر خالہ خالو کے خواب...

پوری پہیلی یونس کے سامنے تھی۔

اس پہیلی کا حل بھی اس کے سامنے تھا۔

لیکن اس میں یونس کا کوئی رول نہ تھا...

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے یونس کے دماغ میں ایک بات آئی۔

کیوں نہ صنوبر کو صورتحال سے آگاہ کیا جائے! اس کے بعد جو ہوگا، سو ہوگا۔

## اٹھارہ

جب یونس ڈیوٹی سے گھر لوٹا، اس وقت دن کے بارہ بجے تھے۔
خالہ گھر میں نہیں تھیں۔ حسب معمول خالہ پڑوسیوں کے گھر بیٹھنے گئی ہوئی تھیں۔
صنوبر لگتا ہے اسکول نہیں گئی تھی اور باورچی خانے میں چاول پکا رہی تھی۔
یونس آج کل صنوبر سے زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ بس، کام بھر کی باتیں۔ وہ سیدھے آنگن میں پانی کے ٹینک کی طرف ہاتھ منھ دھونے چلا گیا۔
گوتچھے سے منھ پونچھتے ہوئے وہ پہلے کمرے میں چلا گیا۔ پردہ اٹھا ہوا تھا۔ باہر سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ شاید بجلی نہیں تھی، ورنہ اس گھر میں ٹی وی کم ہی بند رہتا ہے۔
یونس تخت پر لیٹ گیا۔
اس نے آنکھیں بند کر لیں۔
اس کی پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔
صنوبر کب آ کر دروازے کے پاس کھڑی ہوئی اسے پتہ نہ چلا۔ جب صنوبر نے دروازہ کھولا تو چوں... کی آواز سے اس کی غنودگی تحلیل ہوئی۔
اس نے صنوبر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
اسے لگا کہ صنوبر اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔
یونس اٹھ بیٹھا۔
اس نے صنوبر کے پلٹے ہوئے ہونٹ اور بھاری پلکوں میں قید اداس آنکھوں کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ کتنا پیار تھا صنوبر سے اس کو۔
صنوبر تخت کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

یونس کو لگا کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے آواز گونجی ہو۔ ''صنوبر...!''

صنوبر کچھ نہ بولی۔

''صنوبر، تمہیں معلوم ہے، تمہارے ساتھ دھوکہ ہو رہا ہے۔''

یونس کی بہکی بہکی باتیں سن کر صنوبر ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔

''ڈرو نہیں، یہ سچ ہے... تمہارے ساتھ تمہاری امی ایک کھیل کھیل رہی ہیں۔''

صنوبر نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ لیے۔ ''کیا بک رہے ہو، یونس...؟''

''سچ صنوبر، تمہیں جمال صاحب سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ وہ بڑا دھوکے باز ہے۔ میں کیسے کہوں کہ جمال انکلوا کتنا کمینہ ہے۔''

تبھی دیوار گھڑی ٹنٹنائی۔ ''ٹنن!''

صنوبر نے گھڑی دیکھی۔ ''ایک بج گئے، اماں آتی ہوں گی۔''

یونس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گزشتہ رات کی داستان کو وہ کن لفظوں میں بیان کرے۔

پھر بھی ہمت کر کے وہ بولا۔ ''صنوبر! وہ جمال صاحب تم سے ہمدردی کا دعویٰ کرتا ہے اور جانتی ہو وہ کتنا کمینہ ہے کہ سنو گی تو... اچھا کسی سے بتاؤ گی تو نہیں نہ!''

صنوبر اتنے میں جھنجھلا گئی۔

''نہیں بابا، کسی سے نہیں کہوں گی، تم بتاؤ تو سہی۔''

''تو سنو، کل رات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اللہ قسم، کلام پاک کی قسم جو جھوٹ بولوں مجھے موت آجائے۔ میں نے جمال صاحب اور خالہ کو کل رات ایک ساتھ ایک بستر پر دیکھا ہے صنوبر... تمہیں یقین ہو یا نہ ہو یہ سچ ہے صنوبر...''

صنوبر نے اپنے کان بند کر لیے۔

وہ رونے لگی۔

''کل رات وہ حالات دیکھنے کے بعد کہاں سو پایا ہوں، صنوبر!''

یونس کا دل تو ہلکا ہوا لیکن صنوبر تو جیسے بے جان ہو گئی۔

خالہ آئی تو یونس آنکھیں بند کیے سونے کا ڈراما کرتا رہا۔

صنوبر اپنے کمرے میں لیٹی رہی۔

خالہ یونس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر چیخیں۔ ''کہاں مر گئی کتیا...''

صنوبر نے جواب نہ دیا تو اٹھ کر اندر گئیں اور صنوبر کو جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہوئے بولیں۔

''کیسے پسری ہے مہارانی، کھانا وانا بنے گا یا آج ہڑتال ہے؟ اسی لیے ان سے کہتی ہوں کہ لڑکین کو پڑھوایئے مت، لیکن سنیں تب نہ! آج کل اپنے جمال انکل کی شہ پا کر حرام زادی زبان لڑانا سیکھ گئی ہے۔''

سنوبر کچھ نہ بولی اور اٹھ بیٹھی۔

یونس نے بھی آواز سن کر نیند کھلنے کی اداکاری کی۔

تب تک چٹے پوٹٹے اسکول سے گھر آ گئے اور اتفاق سے لائٹ بھی آ گئی۔ چھٹکی جمیلہ نے بستہ یونس کی گود میں پٹک کر ٹی وی آن کیا۔

ٹی وی سے چپک کر گھنٹوں وہ کارٹون پروگرام دیکھا کرتی ہے۔

یونس نے دیکھا کہ صنوبر گالی کھا کر بھی نہ اٹھی تو خالہ خود باورچی خانے میں جا گھسیں۔

کھانا تو ویسے تیار ہی تھا۔

بس دال بگھارنا باقی تھا۔

دوپہر میں سبزی بنتی نہ تھی۔ دال چاول اچار وغیرہ کے ساتھ کھایا جاتا۔ خالو ''ہری مرچ'' کے ساتھ کھانا کھا لیتے تھے۔

دال بگھار کر خالہ نے یونس کو آواز دی۔

یونس اٹھا اور رسوئی کے پاس دالان میں اپنی سونے کی جگہ ننگی فرش پر بیٹھ گیا۔

صنوبر ویسے ہی گم صم لیٹی رہی اور خالہ کے ساتھ یونس نے کھانا کھا لیا۔

یونس جانتا تھا کہ صنوبر اتنی آسانی سے اس بات پر یقین کرے گی نہیں۔ وہ اپنے تئیں چھان بین ضرور کرے گی۔

پتہ نہیں اس نے کیا چھان بین کی اور اس سے اسے کیا حاصل ہوا لیکن اگلی صبح یونس نے اپنے بستر پر اپنی بغل میں گرماہٹ پائی تو جانا کہ صنوبر اس کے بغل لیٹی ہے۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

صنوبر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

یونس نے پہلے کمرے اور اندر والے کمرے کی طرف دیکھا۔ آہٹ لینے کی کوشش کی۔
دیوار گھڑی پانچ بار ٹنٹنائی۔

اس کا مطلب سبھی سو رہے ہیں۔

خالو تو ڈیوٹی گئے ہوئے ہیں۔

وہ صنوبر کے بغل میں لیٹ گیا۔

صنوبر نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔

تپلی دبلی صنوبر کا نرم گنگنا بدن......

صنوبر اس کے کانوں میں پھسپھسائی۔ ''مجھے بھگا کر لے چلو اس جہنم سے یونس...!''

اس دن اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا کمزور آدمی ہے۔

اس دن اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے لیے ایک نئی زمین تلاش کریگا...

ایک نیا آسمان پیدا کریگا...

ایک نئے خواب کو سچ کریگا...

# ایک نئی پہچان

## ایک

گھنٹی کی ٹنٹناہٹ کے ساتھ پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی۔
رات کے ٹھٹھرتے اندھیرے کو چیرتی پینجر کی سیٹی نزدیک آتی گئی اور چوپن کٹنی پینجر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے پلیٹ فارم پر آ کر رکی۔
اکا دکا مسافر گاڑی سے اترے۔ پوری گاڑی عموماً خالی تھی۔
یونس جلدی سے انجن کی طرف بھاگا۔ وہ انجن کے پیچھے والی پہلی بوگی میں بیٹھنا چاہتا تھا۔ اگر خالو آتے بھی ہیں تو اتنی دور پہنچنے میں انہیں وقت تو لگے گا ہی۔
پہلی بوگی میں وہ چڑھ گیا۔
دروازے سے لگی پہلی نشست پر ایک سادھو مہاراج لیٹے تھے۔
اگلی لائن میں کوئی نہ تھا۔ ہاں، وہاں اندھیرا ضرور تھا۔ ویسے بھی یونس اندھیری جگہ تلاش بھی رہا تھا۔ اس نے اپنا بیگ اوپر والی برتھ پر پھینک دیا اور ٹرین سے نیچے اتر آیا۔
وہ چوکنا سا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔
اچانک اس کے ہوش اڑ گئے۔
اسٹیشن کے داخلی دروازے پر خالو نیلے اوورکوٹ میں نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ وہ لوگ بڑی جلدی سے پہلے گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف گئے۔
یونس فوراً بوگی پر چڑھ گیا اور سنڈاس میں جا چھپا۔

اس کی سانسیں تیز چل رہی تھیں۔
ٹرین وہاں زیادہ دیر رکتی نہیں تھی۔
تبھی اسے لگا کہ کوئی اس کا نام لے کر آواز دے رہا ہے- یو... نو... س! یو... نو... س!
یونس سنڈاس میں دبک کر بیٹھ گیا۔
گاڑی کی سیٹی کی آواز آئی اور پھر گاڑی چل پڑی۔
وہ ایک دم سانس باندھے دبکا رہا۔
جب گاڑی نے رفتار پکڑ لی، پھر اس کی سانس میں سانس آئی۔
بیگ کندھے پر ٹانگے ہوئے ہی وہ کھڑے کھڑے پیشاب کرنے لگا۔
واش بیسن کے پانی سے انگلیوں کو دھوتے وقت اس کی نگاہیں آئینے پر گئیں۔
آئینے کے دائیں طرف اسکیچ پین سے عورت مرد کے خفیہ تعلقات کو بیان کرتی ایک بچکانی تصویر بنی ہوئی تھی۔
یونس نے دل بہلانے کے لیے اس سنڈاس کی دوسری دیواروں پر نگاہ دوڑائیں۔
دیوار میں چاروں طرف اسی طرح کی تصاویر بنی تھیں اور ساتھ میں فحش جملے بھی درج تھے۔
یونس سنڈاس سے باہر نکلا، لیکن وہ چوکنا تھا۔
ٹرین کی کھڑکی سے اس نے باہر جھانکا۔
دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی گاڑی۔ آگے جا کر 'مہدیا' کی روشنی دیکھائی دے گی کیونکہ اگلا اسٹیشن مہدیا ہے۔
سنگرولی کوئلہ علاقے کا آخری کونا مہدیا یعنی گوربی اوپن کاسٹ کان۔
ہوسکتا ہے کہ خالو نے خبر کی ہو تو مہدیا اسٹیشن میں ان کے دوست اس کو تلاش کرنے آئے ہوئے ہوں۔
پہاڑیاں ختم ہوئیں اور روشنی کے قمقمے جگمگاتے نظر آنے لگے۔
اس کا مطلب اسٹیشن قریب ہے۔
مہدیا اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہوتے وقت ٹرین کی رفتار سست ہوئی تو یونس

دوبارہ ایک سنڈاس میں جا گھسا۔وہ کسی طرح کے خطرے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کا اندازہ صحیح تھا۔

اس پلیٹ فارم پر بھی اسے اپنے نام کی گونج سنائی پڑی۔اس کا مطلب یہ سچ تھا کہ خالو نے یہاں بھی اپنے دوستوں کو فون کر دیا تھا۔

وہ سنڈاس میں دبک کر بیٹھا رہا اور پانچ منٹ بعد ٹرین سیٹی بجا کر آگے بڑھ لی۔

یونس نے راحت کی سانس لی۔

سنڈاس سے وہ باہر نکلا۔

اس نے دیکھا کہ سادھو مہاراج کے پاؤں کے پاس ایک عورت بیٹھی ہے۔وہ ایک گنوار عورت تھی۔سادھو مہاراج کے پاؤں دبا رہی تھی۔

یونس نے اس نشست کے سامنے اوپر والی برتھ پر اپنا بیگ رکھا۔پھر کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ کر شیشے کے اس پار اندھیرے کی دیوار کے باہر دیکھنے کی بیکار سی کوشش کرنے کے بعد اپنی برتھ پر اچک کر چڑھ گیا۔

اس کو نیند آنے لگی تھی۔

ایئر بیگ سے اس نے گرم چادر نکالی اور اس کو اوڑھ لیا۔ایئر بیگ اپنے سرہانے رکھ لیا تاکہ چوری کا خطرہ نہ رہے۔

ٹرین کی لکڑی کی بینچ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ویسے تو اس نے گرم کپڑے کافی تعداد میں پہن رکھے تھے، لیکن سردی تو سردی ہی تھی۔رات کے ایک ڈیڑھ بجے کی سردی۔اس کا سامنا کرنے کے لیے اوزار تو ہونے ہی چاہئے۔

وہ اٹھ بیٹھا اور اپنی جیب سے سگریٹ نکال لی۔سگریٹ سلگاتے ہوئے سادھو مہاراج کی طرف اس کی نگاہ گئی۔

گنوار عورت بڑی عقیدت سے سادھو مہاراج کے پاؤں دبا رہی تھی۔

سادھو مہاراج یونس کو سگریٹ سلگاتے دیکھ رہے تھے۔دونوں کی نگاہیں ملیں۔

یونس نے محسوس کیا کہ وہ بھی تمباکو نوشی کرنا چاہتا ہے۔

یونس برتھ سے نیچے اترا۔

اس نے مہاراج کی طرف سگریٹ بڑھائی۔

سادھومہاراج خوش ہوا۔

اس نے سگریٹ سلگائی اور گانجے کی طرح اس سگریٹ کے سٹے مار کر باقی بچی سگریٹ عورت کو دے دی۔

عورت خوش ہوئی۔

اس نے سگریٹ کو پہلے پیشانی سے لگایا پھر بھولے بابا کا پرساد سمجھ کر اس سگریٹ کو پینے لگی۔

عورت کے بال لٹیائے ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سادھوائن بننے کے عمل میں ہو۔ اس کی پیشانی پر بھبھوت کا ایک بڑا سا ٹیکا لگا ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں میں شرم وحیا بالکل نہ تھی۔ وہ ایک مشین سی لگ رہی تھی۔ ہر قسم کی ظاہرداری سے مبرا، سادھومہاراج کی خدمت میں پوری طرح وقف......

سادھومہاراج نے پوچھا۔''کون برادری کا ہے تو؟''

یونس کو معلوم ہے کہ باہر سے پوچھے گئے ایسے سوالات کا کیا جواب دیا جائے۔ جس سے ماحول نہ بگڑے اور کام بھی چل جائے۔

ایک بار اس نے سچ بولنے کی غلطی کی تھی، جس کی وجہ سے اسے بے وجہ تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔

اسے کٹنی میں واقع اس دھرم شالہ کی یاد آ گئی، جہاں وہ ایک رات رکنا چاہتا تھا۔

تب سنگرولی کے لیے چوبیس گھنٹے میں ایک ٹرین چلا کرتی تھی۔ کوتما سے وہ کٹنی جب پہنچا تب تک صبح دس بجے چوپن جانے والی پسینجر چھوٹ چکی تھی۔ اب دو راستے بچے تھے۔ واپس کوتما لوٹ جائے یا پھر کٹنی میں ہی رہ کر چوبیس گھنٹے گزارے جائیں۔ ویسے کٹنی گھومنے پھرنے کے لائق شہر تو ہے ہی۔ کچھ سینما گھروں میں ''صرف بالغوں کے لیے'' والی فلمیں چل رہی تھیں۔ ٹرین میں ہی ایک دوست بنا نوجوان اسے بولا کہ چلو، اسٹیشن کے باہر ایک دھرم شالہ ہے۔ محض دس روپے میں چوبیس گھنٹے ٹھہرنے کا بندوبست۔ کھانا انسان کہیں بھی کھالے گا۔ ہاں، ایک تالا پاس میں ہونا چاہیے۔ دھرم شالہ میں تالا نہیں ملتا۔ جو بھی کمرا ملے اس میں گاہک اپنا تالا خود لگاتا

ہے۔یونس نے کہا تھا کہ تالاخرید لیا جائے گا۔

وہ لوگ اسٹیشن کے باہر نکلے اور سڑک کے کنارے بیٹھے ایک تالا بیچنے والے سے یونس نے دس روپے والا ایک سستا سا تالاخرید لیا۔

وہ دونوں دھرم شالہ پہنچے۔

پیلی اور گیروی مٹی سے رنگی ایک پرانی عمارت کا بڑا سا داصدر دروازہ ،جس کی پیشانی پر لکھا تھا-''جین دھرم شالہ''

وہ اندر گھسے۔

اندر دروازے سے ملا ہوا مینیجر کا کمرا تھا۔

اس وقت وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

ساتھ سفر کرنے والے مسافر نے کہا کہ چلو، دھرم شالہ دیکھ تو لو۔

وہ دونوں اندر کی طرف پہنچے۔دومنزلہ مکان میں چاروں طرف کمرے ہی کمرے بنے تھے۔درمیان میں ایک باغیچہ تھا۔باغیچے کے اندر ایک مندر، پانی کا کنواں، ہینڈ پمپ، اور نل کے کنکشن بھی تھے۔

وہ واپس آئے۔

مینیجر صاحب آ چکے تھے۔

وہ ایک بوڑھے آدمی تھے۔

چشمے کے پیچھے سے جھانکتی آنکھیں۔

انہوں نے رجسٹر کھول کر لکھنا شروع کر دیا-''نام؟''

ساتھ سفر کرنے والے مسافر نے بتایا-''کمل گپتا''

''باپ کا نام؟''

''مسٹر ومل پرساد گپتا''

''کہاں سے آنا ہوا اور کٹنی آنے کا مقصد؟''

''چرمری سے کٹنی آیا، ریڈیو کا سامان خریدنے۔''

''تالا ہے نہ؟''

کمل گپتا نے بتایا۔''جی ہاں!''

مینیجر صاحب نے رجسٹر میں کمل سے دستخط کروا کر اسے کمرہ نمبر پانچ مختص کیا۔

پھر انہوں نے یونس کو مخاطب کیا۔

''نام؟''

''جی، محمد یونس''

فطری طور پر یونس نے جواب دیا۔

مینیجر صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔ان کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔چہرے پر کشیدگی کی علامت صاف دیکھائی دینے لگیں۔

لمبا چوڑا رجسٹر بند کرتے ہوئے بولے۔''یہ دھرم شالہ صرف ہندوؤں کے لیے ہے۔تم کہیں اور جا کر ٹھہرو۔''

ساتھ سفر کرنے والا مسافر کمل گپتا نہیں جانتا تھا کہ یونس مسلمان ہے۔سفر میں بات چیت کے دوران نام جاننے کی ضرورت ان دونوں کو محسوس نہیں ہوئی تھی، شاید اس لیے وہ بھی اسے گھورنے لگا۔

یونس کے ہاتھ میں ایک نیا تالا تھا۔

وہ کبھی مینیجر صاحب کے دماغ پر لگے تالے کو دیکھتا اور کبھی اپنے ہاتھ کے اس تالے کو، جسے اس نے کچھ دیر پہلے باہر سے خریدا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کی عملی کتاب کا ایک اور سبق حاصل کیا تھا۔

وہ سبق تھا، ملک کے ماحول کو دیکھ کر اپنی اصلیت ظاہر کرنا۔

اس نے جانے کتنی غلطیاں کر کے، جانے کتنے سبق یاد کیے تھے۔

سلیم بھائی کے پاس ایسی بدیہی عقل نہ تھی، ورنہ وہ ایسی غلطیاں کبھی نہ کرتا اور گجرات کے قتل عام میں یوں نہ مارا جاتا۔

اسی لیے جب سادھو مہاراج نے اس کی برادری پوچھی تو وہ ہوشیار ہو گیا اور فوراً بتایا۔

''مہاراج جی، میں ذات کا کمہار ہوں۔''

سادھو مہاراج کے چہرے پر سکون چھا گیا۔

چہرہ مہرہ، چال ڈھال، کپڑا لتا اور رنگ روپ سے اسے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک مسلمان نوجوان ہے، جب تک کہ وہ خود ظاہر نہ کرے۔ اسے کیا غرض کہ وہ بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لے۔

وہ اتنا ہوشیار ہو گیا ہے کہ لوگوں کے سامنے ''اللہ قسم'' نہیں بولتا، بلکہ ''خدا قسم'' یا ''ماں قسم'' بولتا ہے۔ ''اللہ جانے کیا ہوگا'' کی جگہ ''خدا جانے'' یا پھر ''رام جانے'' کہہ کر کام چلا لیتا ہے۔

اگر کوئی سادھو یا پادری پرساد دیتا ہے تو باقاعدہ جھک کر بائیں ہتھیلی پہ دائیں ہتھیلی رکھ کر اس پر پرساد لیتا ہے اور اسے کھا کر دونوں ہاتھ سر پر پھیرتا ہے۔ جبکہ وہی سلیم بھائی ہندوؤں سے پوجا پاٹھ وغیرہ کا پرساد لیتا ہی نہیں تھا۔ اگر غلطی سے پرساد لے بھی لیا تو پھر اسے کھاتا نہیں تھا، بلکہ چپکے سے پھینک دیتا تھا۔

یونس کو اگر کوئی پیشانی پہ ٹیکہ لگائے تو وہ بڑی عقیدت ظاہر کرتے ہوئے بڑے پیار سے ٹیکہ لگواتا اور پھر اسے گھنٹوں نہ پونچھتا۔

ایسی حالت میں اس پر کوئی شک کیسے کر سکتا ہے کہ وہ ہندو نہیں ہے۔

ویسے بھی بغیر ضرورت اپنا مذہب ذات ظاہر کر کے پردیس میں انسان کیوں خطرہ مول لے۔

بڑا بھائی سلیم یونس کی طرح چوکنا اور باخبر رہتا۔ خواہ مخواہ میاں کٹ داڑھی، گول ٹوپی، لمبا کرتہ اور اٹنگا پاجامہ پہنتا کرتا تو گجرات میں اس طرح ناحق نہ مارا جاتا...

سادھو مہاراج نے یونس کو دعا دی۔ ''تو بڑا خوش قسمت ہے بچہ! تیری پیشانی بتاتی ہے کہ پہلے جنم میں تو ایک سادھو تھا۔ اس زندگی میں تجھے تھوڑا تکلیف ضرور ہوگی لیکن آخر میں جیت تیری ہی ہوگی۔ تیری خواہشیں ضرور پوری ہوں گی۔

یونس سادھو مہاراج کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ داڑھی بے ترتیب بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر ہوگی یہی کوئی پچاس ایک سال۔ چہرے پہ جھریوں کی لکیریں۔

سادھو مہاراج کی دعاؤں سے یونس کو کچھ راحت ملی۔

وہ دوبارہ اپنی جگہ پر چلا گیا اور بیگ سے لنگی نکال کر اسے برتھ پر بچھا دیا تاکہ لکڑی کی

بنچ کی ٹھنڈک سے ریڑھ کی ہڈی بچی رہے۔

برتھ پر چڑھ کر اس نے جوتے اتار کر پنکھے پر ٹکا دیے۔

اب وہ سونا چاہتا تھا۔

ایک ایسی نیند کہ اس میں خواب نہ ہوں۔

ایک دم بے فکر، مکمل نیند...

جبکہ یونس جانتا ہے کہ اس کو نیند آسانی سے نہیں آیا کرتی۔ نیند بڑی مان منوول کے بعد آیا کرتی ہے۔

اس نے الٹی طرف کروٹ لے لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

کھٹر کھٹ کھٹ...... کھٹر کھٹ کھٹ...... کھٹر کھٹ کھٹ......

ٹرین پٹریوں پر دوڑ رہی تھی۔

صبح چھ بجے تک ٹرین کٹنی پہنچ جائے گی۔ پھر ساڑھے سات بجے بلاس پور والی پسینجر ملتی ہے۔ اس سے بلاس پور تک پہنچنے کے بعد آگے کوتما کے لیے من پڑے گا تو ٹرین یا بس پکڑی جائے گی۔

بلاس پور میں اسٹیشن کے باہر ''ملکیتے'' سے ملاقات ہو جائے گی۔

ملکیتے کے پاپا کا ایک ڈھابا کوتما میں ہوا کرتا تھا۔ سن چوراسی کے سکھ مخالف فساد میں وہ ہوٹل اجڑ گیا۔ سکھ معاشرے میں ایسا خوف بیٹھا کہ عام ہندوستانی شہری دکھنے کے لیے سکھ لوگوں نے اپنے بالوں کو کٹوا لیا تھا۔ ملکیتے تب بچہ تھا۔ اپنے سر پر رومال کے ذریعے وہ بالوں کو باندھا کرتا تھا۔ وہ گورا ناٹا خوبصورت لڑکا تھا۔ یونس کو یاد ہے کہ لڑکے اسے چڑھایا کرتے تھے کہ ملکیتے اپنے سر میں امرود چھپا کر آیا کرتا ہے۔

اس کے پاپا ایک رشتے دار سے ملنے رانچی گئے تھے اور اندرا گاندھی کا قتل ہو گیا۔ وہ اس وقت سفر کر رہے تھے۔ سنتے ہیں کہ سفر کے دوران ٹرین میں انہیں مار دیا گیا تھا۔

اس مشکل وقت میں ملکیتے نے اپنے بالوں کو کٹوا لیا تھا۔

ملکیتے کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ سن چوراسی کے بعد ملکیتے کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی۔

تب ملکیتے کی امی اپنے بھائی یعنی ملکیتے کے ماما کے پاس بلاس پور چلی گئی تھیں۔ وہیں ماما کے ہوٹل میں ملکیتے مدد کرنے لگا تھا۔

اسٹیشن کے باہر ایک سبزی خوروں اور گوشت خوروں کا ہوٹل ہے۔ ''شیر پنجاب ہوٹل'' یہی تو پتہ ہے اس کا۔

اتنے دنوں کے بعد ملنے پر جانے وہ پہچانے یا نہ پہچانے، لیکن ملکیتے ایک نمبر کا یار تھا اس کا!

یونس نے فٹ پاتھی یونیورسٹی کی پڑھائی کے بعد اتنا اندازہ لگانا جان لیا تھا کہ اس دنیا میں جینا ہے تو پھر خالی ہاتھ نہ بیٹھے کوئی۔ کچھ نہ کچھ کام کرتا رہے۔ تنہا بیٹھ کر آنسو بہانے والوں کے لیے اس فانی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

اپنے وجود کو بچائے رکھنے کے لیے انسان کو تبدیلی لانا ضروری ہے۔

لکیر کے فقیر آدمی کا جینا مشکل ہے۔

جیسا دیس ویسا بھیس...

مشکل سے مشکل حالات میں بھی انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔

اسی لیے تو وہ امی ابو، گھر بار، بھائی بہن، رشتے ناطے وغیرہ کے پیار میں پھنسا نہیں رہا۔

اپنا راستہ خود چننے کی چاہت ہی تو ہے کہ آج وہ مسلسل جلاوطنی کا درد جھیل رہا ہے۔

اسی امید میں کہ اس بار کی چھلانگ سے شاید اللہ کی بنائی اتنی بڑی کائنات میں اسے بھی کوئی آزاد پہچان مل ہی جائے...

☆☆

## دو

یونس نے سوچا کہ صبح کٹنی پہنچ کرناشتہ کرنے کے بعد بلاس پور والی گاڑی پکڑی جائے گی۔
کٹنی کا خیال دماغ میں آیا تو یونس کو بڑکی آپا یاد ہو آئی۔
کہتے ہیں کہ بڑکی آپا کٹنی میں کہیں رہتی ہے۔
خالہ بھی تو بتا رہی تھیں کہ اماں ایک بار چوری چھپے اس سے مل آئی ہیں۔ چونکہ اس نے ہندو مذہب اپنا لیا ہے، اس لیے اسے اب برادری میں ملایا تو نہیں جائے گا۔
یونس سوچ رہا تھا کہ ان کے گھر میں ایک بھی اولاد ٹھیک نہ نکلی؟ اس کی وجہ کیا ہے؟
اس نے بچپن کے تمام واقعات کو دہرانا چاہا۔ معلوم ہوا کہ اس کے ابا زیادہ اولاد پیدا کرنے کے فرض کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس مقدس قربانی سے فرصت پانے کے بعد ان کا فکر کا مرکز ملازمت ہوا کرتی۔ ابا دن بھر میں ایک بنڈل بیڑی اور ایک روپے کا تمبا کو ہضم کر جاتے۔ چائے عموماً گھر میں ہی پیتے۔ اس کے بعد بھی اگر وقت بچ جاتا تو مقامی قادریہ مسجد کمیٹی کے لوگوں کے درمیان اٹھتے بیٹھتے۔ ان کے ایک اور ہمدرد دوست تھے تنہو بھائی، جنہیں یونس تنہو چچا کہا کرتا۔
ابا نے اپنی بے شمار آل اولاد کی تعلیم تربیت، کپڑا لتا اور کھان پان کے بارے میں کبھی توجہ نہیں دی۔ بچے چاہے جیسے اپنی زندگی گزاریں، آزاد ہیں۔
اماں بھی ابا کے قدم سے قدم ملا کر چلتی رہیں۔ انہوں نے ہر تین برس پر ایک اولاد کے اوسط کو برقرار رکھا۔ بچہ اپنی کوشش سے چھاتی تلاش کر کے منھ میں ٹھونس لے تو ٹھیک، ورنہ اماں کے بھروسے رہا تو بھوکا ہی رہ جائے گا۔
اماں زیادہ تر اپنے بستر میں پسری رہا کرتی تھیں۔ سردی کے دنوں میں ابا یا کہ بڑکی پلنگ کے نیچے بورسی میں آگ ڈال کر رکھ دیا کرتے۔ یونس اس پلنگ پر کبھی کبھی سوتا تھا۔ بورسی کی

آنچ سے گدڑی گرم ہو جاتی اور پیٹھ کی اچھی سنکائی ہو جاتی تھی۔

اماں اپنے سکھ دکھ یا پھر اپنی ہاری بیماری کی فکر کیا کرتی تھیں۔

ہاں، دن بھر چاہے جس حالت میں رہیں، شام ہوتے ہی اچھے سے چہرہ دھو پونچھ کر اسنو پاؤڈر لگا لیتیں۔ آنکھوں میں کاجل اور مانگ ''اپھسن'' (افشاں) سے بھرتیں۔ جسم پھیل کر بکھر گیا ہے تو کیا، بننا سنورنا تو انسان کی فطرت ہوتی ہے۔ ہاں، لپ اسٹک کی جگہ ہونٹ پان کی لالی سے رنگے ہوا کرتے۔

اماں کو بھی ابا کی طرح اپنی ڈھیر ساری اولادوں کی کوئی فکر کبھی نہیں رہی۔

اس افراتفری کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونس کی بڑی بہن بڑکی ابھی صحیح طریقے سے جوان ہو بھی نہ پائی تھی کہ گھر سے بھاگ گئی۔

یونس کو یاد ہے کہ بڑکی اس سے کتنا پیار کیا کرتی تھی۔

یونس تب چار پانچ سال کا رہا ہوگا۔

بس جب دیکھو تب اپنی بڑکی آپا کے پاس منڈراتا رہتا۔ اماں کو تو بچوں کی سدھ ہی نہ رہتی تھی۔

پڑوس میں ایک سندھی پھل والا رہتا تھا۔

سندھی پھل والا صبح نو دس بجے ٹھیلے پر پھل سجایا کرتا۔ وہ شہر میں گھوم گھوم کر پھل فروخت کرتا تھا۔ نو بجے گھر کے سامنے والا عوامی نل کھلا کرتا تھا۔ آدھے پونے گھنٹے بھیڑ رہا کرتی، پھر جب لوگ کم ہو جاتے تب بڑکی بالٹی لے کر پانی بھرنے نکلتی۔ یونس بھی اپنی بڑکی آپا کے پیچھے ایک ڈبا یا ڈیگچی لے کر پانی بھرنے چلا آتا۔

بڑکی آپا پانی بھرنے لگتی اور سندھی پھل والے کو دیکھ کر مسکرایا کرتی۔

تب پھل والا یونس کو اشارے سے اپنے پاس بلاتا۔

یونس پھل کی لالچ میں دوڑا چلا جاتا۔

سندھی پھل والا اس کو دو کیلے دیتا۔ کہتا، ایک اپنی آپا کو دے دینا۔

یونس بڑے شوق سے اپنے حصے کا کیلا کو کھاتا اور بڑکی آپا کے حصے کا کیلا اسے دے دیتا۔ بڑکی آپا کیلا ہاتھ میں پکڑتی تو اس کے گال شرم سے سرخ ہو جاتے۔ یونس کو کیا پتہ تھا کہ اس

کیلے کے ذریعے ان دونوں کے درمیان کس طرح کا ''کوڈ ورڈ'' چل رہا تھا۔ وہ تو چتی دار کیلے کا ذائقہ کافی دیر تک اپنی زبان میں بسائے رکھتا تھا۔

رات کے نو بجے بڑی آپا یونس کا ہاتھ پکڑ کر ٹہلنے نکلتی۔

تب سندھی پھل والا پھیری لگا کر واپس لوٹ آتا تھا

بڑی آپا سے جانے کیا اشارے اشارے میں وہ باتیں کیا کرتا۔

یونس کو پچکار کر پاس بلاتا۔

کوئی سڑا سیب یا کیلا اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتا۔

یونس خوش ہو جاتا۔

یونس رات میں بڑی آپا کے پاس ہی سویا کرتا تھا۔

بڑی آپا اسے اچھی طرح سینے سے چپکا کر سلایا کرتی اور بہت محبت کیا کرتی۔

کبھی کبھی سندھی پھل والے کا آپا کے ساتھ کیا گیا رویہ ننھے یونس کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ چونکہ بڑی آپا برا نہیں مانتی تھی اور شرما کر ہنس دیتی تھی، اس لیے یونس سندھی پھل والے کی حرکتوں کو چپ چاپ ہضم کر جایا کرتا تھا۔

ایک دن یونس کے دوست چھنگو نے اسے بتایا کہ یار، اگر تو برا نہ مانے تو ایک بات کہوں۔ یونس نے اسے ڈپٹ دیا کہ زیادہ تمہید نہ باندھتے ہوئے مدعے پر آجائے۔

چھنگو بے چارہ کہنے میں ہچکچا رہا تھا کہ کہیں یونس اسے پیٹ نہ دے، اس لیے اس نے ایک بار پھر یونس سے پوچھ لیا کہ بھائی میرے، تو برا تو نہیں مانے گا۔

غصہ ہو کر یونس نے اس کی گردن پکڑ کر ہلا دیا۔

چھنگو کی آنکھیں باہر نکلنے کو ہوئیں، تب اس نے کہا۔ ''چھوڑ دے بے، بتاتا ہوں... کل رات گھر کے پیچھے میں نے دیکھا تھا کہ وہ سندھی پھل والا تیری بہن کو چوما لے رہا ہے۔''

یونس کا خون کھول اٹھا۔ ''تو؟''

چھنگو گھبرا گیا۔ ''اسی لیے میں بول رہا تھا کہ برا نہ ماننا۔''

یونس نے اسے کچھ نہ کہا۔

اس نے خود اپنی آنکھوں سے ایسا ہی ایک ممنوعہ منظر دیکھا تھا۔ واقعی بڑی حد سے

آگے بڑھ رہی ہے۔اماں اور ابا کو تو بچے پیدا کرنے سے فرصت ملتی نہیں کہ وہ بچوں کے بارے میں سوچیں۔

ایک دن یونس پیچھے آنگن میں کھڑے کھڑے پیشاب کر رہا تھا تب اس نے امرود کے پیچھے دیکھا کہ سندھی پھل والا اور بڑکی کافی دیر تک ایک دوسرے سے چپکے کھڑے تھے۔

یونس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ فوراً کیا کرے۔اس نے ایک پتھر اٹھایا اور سندھی پھل والے کی پیٹھ پر دے مارا۔

پھل والے نے برا نہیں مانا، بلکہ مار کھا کر وہ دونوں بڑی دیر تک ہنستے رہے تھے۔

سندھی پھل والا یونس کو سالا کہا کرتا اور ایک محاورہ اچھالا کرتا -''ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف!''

اس گپ چپ چلتی محبت کی کہانی کی جانکاری صرف یونس کو تھی۔

سلیم بھائی گھر سے زیادہ مطلب نہ رکھتا لیکن اس بڑکی کی کارستانی کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس نے اماں سے بتایا بھی تھا کہ نالائق بڑکی کو ڈانٹے کہ اس سندھی پھل والے سے دور رہے۔ لیکن اماں کو کہاں فرصت تھی... اس وقت چھوٹکی پیٹ میں تھی۔وہ تو اپنی صحت کو لے کر ہی پریشان رہا کرتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ سلیم بھائی نے ایک بار اپنے دوستوں کے ساتھ اس پھل والے کو ڈرایا دھمکایا بھی تھا۔اس کے دوستوں نے سندھی پھل والے کے ٹھیلے پر بچے ہوئے پھل لوٹ لیے تھے اور اسے خبردار کیا کہ اپنی عادت سے باز آجائے۔

جب سندھی پھل والے اور بڑکی نے دیکھا کہ ان کی محبت کے کاروبار میں دشمن ہزار ہیں تو ایک دن بڑکی آپا اس سندھی پھل والے کے ساتھ کہیں بھاگ گئی۔

کہتے ہیں کہ وہ لوگ کٹنی چلے گئے ہیں۔

کٹنی تو سندھیوں کا گڑھ ہے گڑھ...

اسی لیے یونس کو کٹنی سے چڑھ ہے۔

بڑکی کے گھر سے بھاگ جانے کے بعد جس کا دل سب سے زیادہ پریشان ہوا وہ سلیم بھائی تھا۔جانے کیوں بدنظمی کا وہ بہت مخالف ہوا کرتا تھا۔وہ اپنے دوستوں میں، اپنے معاشرے

میں، اپنی اور اپنے خاندان کی عزت بڑھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ بڑکی نے گھر سے بھاگ کر جیسے سر بازار اس کی ناک کٹوا دی ہو۔ سلیم بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ کئی دنوں تک سندھی پھل والے اور اس کے گھر والوں کی ٹوہ لیتا رہا تھا۔ اگر اس درمیان وہ مل گیا ہوتا تو پکا تھا کہ فوجداری ہو جاتی اور باقی زندگی سلیم بھائی جیل میں کاٹتے۔

بڑے ضدی مزاج کا تھا سلیم بھائی۔

سنتا سب کی لیکن کرتا اپنے من کی۔

ہوش سنبھالتے یونس کے بڑے بھائی سلیم نے دیکھا کہ اس گھر کے رنگ روپ میں اب زیادہ دن کا رول اس کے لیے نہیں۔ اماں اور ابا جس طرح گھر چلا رہے تھے، اس میں سلیم کو اپنا مستقبل تاریک لگا۔

بڑکی آپا کے گھر سے فرار ہو جانے کے بعد سلیم نے دوستوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔

کچھ دن وہ گھر میں قید رہا۔

ایک دم انجان جیسی زندگی...

اماں ابا سب اس کی حالت دیکھ کر پریشان رہنے لگے تھے۔

پھر ایک دن وہ فجر کی اذان سن کر جامع مسجد کی طرف چلا۔ وہاں اسے نماز پڑھنے کے بعد تبلیغی جماعت والوں کے منھ سے تقریر سننے کو ملی۔ دہلی سے جماعت آئی ہوئی تھی۔ تبلیغی جماعت والوں کے رہن سہن اور زندگی گزارنے کے طریقے سے اسے سبق ملا۔

اس کے ہنگامہ خیز دل و دماغ کو سکون ملا۔

ان لوگوں سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس دن گھر نہ لوٹا۔

تبلیغ والوں کے ساتھ ہی مسجد میں قیام کیا۔

شام کو عصر کی نماز کے بعد جماعت کے لوگ مقامی سطح پر لوگوں سے براہ راست رابطہ کرنے کے لیے گشت پر نکلے۔

وہ بھی ان کے ساتھ گشت پر نکلا۔

امیر جماعت کس طرح غیر کلمہ گو لوگوں کو دین ایمان کی دعوت دیا کرتے ہیں، اس نے دیکھا۔

پھر مغرب کی نماز کے بعد ذکر اور عشاء کی نماز کے بعد اللہ کی تسبیح اور یاد اور گہری نیند کا ایمان......

سلیم بھائی تب باقاعدگی سے جامع مسجد میں نماز پڑھنے جانے لگا۔

کبھی کبھی چند غیر ملکی مسلمان بھی مذہب منادی اور قلبی سکون کے مقصد سے آیا کرتے تھے۔

ابا تو کٹر بریلوی خیالات کے تھے۔ وہ تبلیغیوں کو ''مردود وہابی'' کہا کرتے اور اکثر ایک تک بندی پڑھا کرتے تھے۔

مردود وہابی کی یہی نشانی

اٹھنگا پاجاما،

ٹکلا سر اور کالی پیشانی

بریلوی لوگوں کی پوشاک دیوبندیوں سے مختلف ہوا کرتی۔ دیوبندی جہاں اپنے سر کے بال صفاچٹ کرواتے ہیں وہیں بریلوی لوگوں کے بال کان کے اوپر بڑھے ہوتے ہیں۔ دیوبندیوں کی مونچھیں صفاچٹ رہیں گی جبکہ بریلوی لوگ پتلی تراشی ہوئی مونچھیں رکھتے ہیں۔ بریلویوں کا پاجاما یا شلوار ٹخنوں کے نیچے تک رہتا ہے۔ ان کی ٹوپیاں کالی رہتی ہیں۔ سفید ٹوپیاں ہوں تو کچھ آسمان کی طرف زیادہ اٹھی ہوئی رہیں گی۔ ان کے کندھے پر شترنجی ڈیزائن کا گونچھا ہوا کرتا ہے۔

یونس نے دیوبندی اور بریلوی دونوں طرح کے مسلمان قریب سے دیکھے ہیں۔ اسے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ بریلوی لوگوں کے ماتھے پر بار بار سجدہ کرنے سے کسی طرح کا داغ نہیں بنتا ہے، جبکہ اسی کے الٹ دیوبندی ابھی مہینے بھر کا پکا نمازی بنا نہیں کہ اس کی پیشانی پر گول سیاہ داغ ابھر آتا ہے۔

یہ ایسی بنیادی پہچان ہے جسے دونوں عقیدے کے لوگ اپنا الگ الگ ''ڈریس کوڈ'' بنائے ہوئے ہیں۔ اسی پہناوے اور دیگر ''آؤٹ لک'' سے مسلمان جان جاتے ہیں کہ میاں کس عقیدے کا ہے۔

تعلیم یافتہ طبقے کا عہدے دار مسلمان جوان سب بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا اس کے

عقیدے کے بارے میں جاننا مشکل ہوتا ہے

اس میں تو اتنی مشکل پیش آتی ہے کہ کوئی یہ بھی نہ جان سکیں کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان...

یونس نے اپنی زندگی کے سفر میں اتنا جان لیا تھا کہ ہندوستان میں رہنا ہے تو وندے ماترم کہنا پڑے گا...

اس لیے اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک مسلم نوجوان ہے۔

ابا، سلیم بھائی کے تبلیغی لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کی مخالفت کرتے۔

سلیم ہر وہ کام کرتا جس سے ابا کو دکھ پہنچتا۔ وہ انہیں تکلیف پہنچا کر سکون حاصل کیا کرتا تھا۔ جانے کیوں سلیم بھائی اتنا کٹر ہو گیا تھا۔

تبلیغی جماعتیں جب شہر میں آتیں، امیر جماعت وزیر بھائی سلیم کو بلا بھیجتے۔ سلیم بھائی ان جماعت والوں کا مقامی مددگار ہوا کرتا۔ وہ آنے والی جماعت کا استقبال کرتا۔ انہیں مسجد کے ایک کمرے میں ٹھہراتا۔ انہیں کہاں کھانا پکانا ہے، کہاں نہانا ہے اور کہاں پاخانے جانا ہے، پینے کے پانی کا انتظام کہاں سے ہوگا، تمام معلومات وہ دستیاب کراتا۔

تبلیغی جماعت کے لوگ انتہائی نظم وضبط میں رہا کرتے۔ امیر جماعت کے حکم پہ سبھی عمل کیا کرتے۔

جماعت والوں کا بہت سخت معمول ہوا کرتا تھا۔

گھڑی دیکھ کے تمام کام...

یونس بھی کبھی کبھار سلیم بھائی کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا۔

جب شہر کا سب سے خوبصورت مندر ایک چھوٹے سے چبوترے پر تھا۔ جب یہاں پولیس تھانہ اور ریلوے اسٹیشن کے علاوہ کوئی پکی عمارت نہ تھی۔ تب شہر میں مسجد کے نام پر بنے میاں کی پرچھی ہوا کرتی تھی۔ بنے میاں کو آل اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اپنی زمین انجمن کمیٹی کو وصیت کردی تھی۔

بنے میاں نے ایک پکی مسجد کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے۔

پھر مقامی سطح پر چندہ کر کے وہاں ایک چھوٹا سا پکا ہال بنا۔

مسجد کے صحن میں ایک کنواں تھا۔ اس کنوئیں کا پانی بڑا میٹھا تھا۔ موسم گرما میں بھی پانی ختم نہ ہوتا۔ کمیٹی والوں نے اس پر کور لگا دیا۔ رسی بالٹی کے لیے چھوٹا سا سوراخ تھا۔ کنوئیں کے ایک طرف دو کمرے تھے، جنہیں غسل خانہ کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف گھر کے پیچھے استنجا (پیشاب) کے لیے طہارت خانہ تھا۔ پھر ایک سیٹ والا بیت الخلا یعنی کہ 'سیفٹک ٹینک' پا خانہ تھا۔

اس مسجد کے پیش امام بڑے قابل بزرگ تھے۔ محتاط زندگی، نیکی، پرہیزگاری اور روحانیت کے حامی۔ لمبا قد، پتلا دبلا جسم، لمبی سی سفید داڑھی۔ بولتے تو منہ پر ہاتھ رکھ لیا کرتے۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس کافی روحانی طاقت تھی۔ وہ گنڈہ تعویز وغیرہ نہیں دیا کرتے تھے۔ ہاں، دعائیں کثرت سے دیا کرتے اور ان کی دعائیں ''اللہ رب العزت'' کی بارگاہ میں قبول ہوا کرتی تھی۔

وہ قرآن شریف کی اتنی خوبصورت تلاوت کیا کرتے کہ سننے والا بے خود ہو کر سنتا رہے۔ ایک دم خالص عربی کا تلفظ۔ گلے کی بہترین آواز۔ قرات ایسی کہ بس سنتے چلے جایئے۔

یونس کبھی کبھی جمعہ کی نماز پڑھنے اسی مسجد میں جاتا۔

سلیم بھائی وہاں ایک طرح سے بلا معاوضہ مؤذن بن چکا تھا۔ مؤذن کی غیر موجودگی میں وہ مسجد کا کام سنبھالا کرتا تھا۔

اسی وجہ سے سلیم بھائی کسی طرح کا کام نہیں سیکھ پایا۔

مذہب پر یونس کا اس قدر انحصار نہ تھا، بلکہ ذہن کی تبدیلی کے لیے وہ مذہب کے قریب آیا کرتا تھا۔ جیسے کہ ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے فلم دیکھنا، قوالی سننا، فٹ بال میچ کھیلنا، وجئے بھیا کے ساتھ آر ایس ایس کی ٹیم میں جانا یا پھر گپیں مارنا...

سلیم بھیا اسی طرح تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ رہتے رہتے جماعت میں چالیس چالیس دن کے لیے باہر نکل جایا کرتا تھا۔

ابا کو ان کے بریلوی علماء سے فتویٰ مل چکا تھا کہ ایسا شخص جو دیوبندیوں کے عقیدے پر یقین کرے، ان کے ساتھ اٹھے بیٹھے، اس کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے، یہاں تک کہ اگر وہ اپنا بیٹا، بیٹی، ماں یا باپ یا بھائی بہن ہی کیوں نہ ہو!

ابا کے پاس اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں کی بتائی ہوئی ہدایات تھیں، جسے وہ پہلے کمرے کی دیوار پر لگائے ہوئے تھے۔ اس کی کچھ باتیں آج بھی یونس کو یاد ہیں۔

وہابیوں، دیو بندیوں سے نفرت کرو۔

وہابیوں، دیو بندیوں کے علماء کے پیچھے نماز پڑھنا منع ہے۔ اس سے نماز نہیں ہوگی اور نماز پڑھنے والا گناہ گار بھی ہوگا۔

اگر کوئی مسلمان اپنا نکاح یا اپنے بیٹی بیٹے کا نکاح، وہابی یا دیو بندی سے کرے گا تو نکاح ہرگز نہ ہوگا۔

وہابیوں، دیو بندیوں کو دعوت کھلانا، ان کی دعوت کھانا دونوں باتیں ناجائز ہیں۔

سلیم بھائی کی سرگرمیاں کسی سے پوشیدہ نہ تھیں۔ ویسے بھی وہ جگہ تھی ہی کتنی بڑی کہ چیزیں دبی رہ سکیں۔

شہر کے ایک کونے میں چھینکیے تو دوسرے کونے تک آواز چلی جائے۔

بریلوی علماء، مقامی مدینہ مسجد کی کمیٹی کے ممبران کے سمجھانے سے تنگ آکر ابا نے اعلان کر دیا تھا کہ سلیم ان کی اولاد نہیں۔

وہ سلیم بھائی کو اپنی اولاد ماننے سے انکار کر چکے تھے۔

اتنی پابندیوں سے پریشان ہو کر سلیم بھائی گھر سے بھاگ کر سنگرولی خالہ کے پاس چلا گیا۔

وہاں خالو نے سلیم بھائی کو بیڑھن میں ایک ٹین کے چادر سے پٹیاں بنانے والے کارخانے میں کام دلوا دیا تھا۔

ویسے خالو بھی دیو بندیوں سے چڑھتے تھے۔

وہ ایک کٹر سنی تھے اور بریلوی عقیدے کو مانتے تھے، لیکن خالہ کی مداخلت کی وجہ سے وہ سلیم بھائی کی موجودگی گھر میں برداشت کیا کرتے تھے۔

شروع میں سلیم بھائی بریلویوں والی مسجد میں نماز پڑھتا تھا، کیونکہ جس کے یہاں وہ یہاں کام سیکھا کرتا تھا وہ کٹر مزاج کا تھا۔ تبلیغیوں اور دیو بندیوں سے بے حد چڑھا کرتا تھا۔ جب سلیم بھائی کام اچھے سے سیکھ گیا تو وہ ایک دوسری فیکٹری میں چلا گیا۔ یہ بھی ایک مسلمان کی ہی فیکٹری تھی لیکن یہ جناب دیو بندی خیالات کے انسان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سلیم بھائی کے خالو بریلوی ہیں، پھر بھی انہوں نے سلیم بھائی کو اپنے یہاں کاریگر رکھ لیا۔ اب سلیم بھائی بیڑھن

کی دیو بندیوں والی مسجد میں نماز پڑھنے جانے لگا۔

یہ بات خالو کو معلوم ہوئی تو انہوں نے خالہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ وہابیوں کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کر پائیں گے۔

خالہ نے سلیم بھائی کو سمجھایا بجھایا۔ اسے دنیا داری کی باتیں سکھانا چاہیں۔ سلیم بھائی کہاں ماننے والا تھا۔

اس درمیان خالو آ گئے تو سلیم انہیں ہی تبلیغ کرنے لگا۔

''قبروں کی پوجا ٹھیک نہیں۔ اصل چیز ہے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ دین میں رائی رتی کا اضافہ کرنے والا بدعتی (دیو بندی لوگ بریلویوں کو بدعتی کہتے ہیں اور بریلوی دیو بندیوں کو وہابی!) کہلاتا ہے۔ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اگر سچی محبت ہے تو ایک سچے مسلمان کو حق پر چلنا چاہئے۔ بدعتوں سے بچنا چاہئے۔''

اتنی نصیحت سن کر فوجی خالو تو جیسے آپے سے باہر ہو گئے۔

انہوں نے خالہ کا لحاظ چھوڑ کر سلیم بھائی کو فوراً گھر سے نکلنے کا فرمان دے دیا تھا۔

پھر سلیم بھائی بیڑھن کی فیکٹری میں ہی رہنے لگا تھا۔

وہیں اس کا رنگ روپ بدل گیا تھا۔

اب وہ قمیض پتلون پہننا چھوڑ کر کرتہ شلوار پہننے لگا تھا۔ چونکہ اس کا بدن گٹھا ہوا تھا اور قد درمیانہ تھا، اس لیے اس پر گھٹنوں کے نیچے لٹکتا کرتہ اور ٹخنوں سے اوپر اٹھی شلوار خوب جمتی تھی۔ سر پر وہ سفید گول ٹوپی لگانے لگا تھا۔ وہ ایک روایتی مسلمان نظر آتا تھا۔ جیسے کہ دیو بند کے دارالعلوم کے طالب علم دکھا کرتے ہیں۔

خالہ جب کبھی بیڑھن جاتیں تو سلیم بھائی سے ملا کرتیں۔

انہیں سلیم بھائی سے بڑی محبت تھی۔

سلیم بھائی نے اپنی کمائی سے خالہ کے لیے کئی ساڑیاں خریدی تھیں۔

پھر سننے میں آیا کہ کسی تبلیغی جماعت کے ساتھ سلیم گجرات کی طرف چلا گیا ہے۔ گجرات کے وڑودرا سے ایک دو خط بیڑھن فیکٹری میں آئے تھے، جس میں خالہ کے لیے سلیم بھائی الگ سے خط لکھا کرتا تھا۔

سلیم بھائی کے آخری خط سے پتہ چلا تھا کہ وہ ایک تبلیغی خاندان میں گھر جمائی بن گیا ہے۔

اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں وہ۔

پھر ایک دن گجرات کے فسادات میں اس کے مارے جانے کی خبر آئی۔

سلیم بھائی کا پہناوا اور رہن سہن گودھرا سانحہ کے بعد گجرات میں اس کی جان کا دشمن بن گیا تھا......

## تین

کھٹر کھٹ ......کھٹ، کھٹر ......کھٹ، کھٹ ......کھٹ ......
ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہوئی ٹرین کی ایک لمبی چیخ...
ٹرین کی پٹریوں کے بدلنے کی آواز کے ساتھ بریک کی چیں... چا...
اور ٹرین رک گئی۔

کھڑکیوں کے باہر روشنی کی جھلک نہیں۔ اس لائن کے بیشتر اسٹیشن تو بغیر بجلی بتی والے ہیں۔

امکان ہے کہ آؤٹر پہ ٹرین رکی ہوگی یا پھر کوئی اسٹیشن ہی ہو۔

چوپن سے سنگرولی کے درمیان سنگل لائن ہے۔ ویسے تو رات کی یہ پینجر فاسٹ پینجر کے نام سے چلتی ہے اور چھوٹے موٹے اسٹیشن پر رکتی نہیں لیکن کراسنگ کے نام پر اس کو روکا ہی جاتا ہے۔

چائے پانی کے لیے رات کے سفر میں ''بیوہاری'' ہی ایک اسٹیشن ہے جہاں کچھ امید کی جاسکتی ہے۔ دن میں ''سرئی گرام'' اور ''کھنہ بجاری'' اسٹیشن میں چائے ناشتہ ملتا ہے۔

گارڈ، ڈرائیور اور مسافر ایسی جگہوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔
یونس کو نیند نہیں آرہی تھی۔
اس نے نیچے کی سیٹ پر نگاہ دوڑائی۔
دیکھا کہ سادھو مہاراج کمبل اوڑھے پڑے ہیں۔
ان کے پاؤں اس عورت کی گود میں ہیں۔
عورت گہری نیند میں ہے۔

اس کی چھاتی سے آنچل ہٹا ہوا ہے۔

بھری بھری چھاتیاں اور چہرے پر سکون کے نشانیاں......

یونس نے سوچا کہ کتنی مست زندگی ہے یہ بھی!

ایک دم فراموشی کی زندگی!

کمانے کھانے کی کوئی فکر نہیں۔

دین دنیا کی فکر نہیں۔

ذاتی دولت کی لالچ نہیں۔

بس، ایک لامتناہی سفر میں چلتی زندگی...

بڑے بھائی سلیم نے ایسی ہی راہ اپنائی تھی۔اس نے سوچا تھا کہ اسی طرح تبلیغ (مذہب پھیلانا) کرتے کرتے وہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت (جنت) کے امتحانات میں کامیاب رہے گا۔اس نے خود کو مکمل طور سے اس مذہبی تحریک کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

اور ایک ایمان رکھنے والا، مذہبی رجحان کا عام نوجوان سلیم گجرات کے فسادات کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

یونس سلیم بھائی کی یاد میں کھو گیا تھا...

اسے آج بھی یاد ہے وہ دن جب آدھی رات کو گھر کی گھنٹی بجی تھی۔

گھر میں یونس اور ببیا ہی تھے۔

ابا آفس کے کام سے شہڈول گئے تھے۔

اماں پڑوسی مہتاب بھائی کے ساتھ ''گڑھوا پالوم'' گئی ہوئی تھیں۔

مہتاب بھائی کی منگنی ہونے والی ہے۔اس نے خود اماں کو اپنے ساتھ لے چلنے کی ضد کی۔اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔اماں کو تو گھر چھوڑنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہئے۔ببیا اور یونس تو ہیں ہی گھر کے کتے۔بھونک بھونک کر گھر کی حفاظت یہی لوگ تو کرتے ہیں۔

باقی لوگ تو مالک ٹھہرے۔

دوبارہ گھنٹی بجی تو یونس نے آواز لگائی۔''کون؟''

لگا نہو چچا کی آواز ہے۔''میں ہوں بھائی، نہو...!''

یونس کو تعجب ہوا کہ نہو چچا اور اس وقت!

بیبیا اندر والے کمرے میں گھوڑا ہاتھی بیچ کر سو رہی تھی۔

یونس نے جلدی سے چڈی پر گونچھا لپیٹا اور دروازہ کھولا۔

نہو چچا ہی تو تھے۔

دبلا پتلا جسم، لنگی اور کرتہ پہنے، سر پر دو پلی ٹوپی۔

بے ترتیب سی کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے-''گلو کا فون آوا ہے... تمہارے ابا کہاں ہیں؟''

یونس نے انہیں سلام کیا اور اندر آنے کو کہا۔

نہو چچا انتہائی گھبرائے ہوئے تھے-''ابا اماں کو نو نہیں ہیں کا؟''

یونس من ہی من ڈر گیا۔

جانے کیا بات ہے کہ نہو چچا ایسے گھبرا رہے ہیں۔

اس نے دل سخت کر کے پوچھا-''کا بات ہوگئی چچا؟''

نہو چچا کی آنکھیں نم ہو آئیں۔

''کچھ نہ پوچھو، صرف اپنے ابا یا اماں سے بات کرا دو، بچوا!''

''دونوں نہیں ہیں گھر میں، ابا تو شہڈول گئے ہیں، کسی بھی وقت آ سکتے ہیں لیکن اماں بہار گئی ہوئی ہیں۔ آپ ہمیں بتایئے نہ کا بات ہے؟''

نہو چچا کے بیٹے گلو یعنی پیر غلام نے ہی ایک بار بتایا تھا کہ یونس کا بڑا بھائی سلیم گجرات کے بڑودہ شہر میں رہتا ہے۔

وہ تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ گجرات چلا گیا تھا۔

وہیں ایک تبلیغی میاں بھائی اسماعیل صدیقی نے اسے اپنا گھر جمائی بنا لیا۔

اسماعیل صدیقی کی چھوٹی موٹی دکانداری ہے۔ اکلوتی بیٹی کے لیے نیک داماد سلیم۔ سلیم وہیں مزے میں ہے۔

پیر غلام جب بھی بڑودہ سے کوتما آتا، سلیم بھائی کا پیغام لے کر آتا۔ اس نے ایک بار بتایا تھا کہ بدقسمت سلیم نے سسرال والوں کے سامنے اپنے سگے لوگوں کو مردہ مان لیا ہے۔ اب وہ

کبھی لوٹ کر ادھر نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد جان لیا ہے۔ سلیم سرِ عام اعلان کرتا ہے کہ اس نے اللہ کی بنائی اس کائنات میں اپنے نئے ماں باپ پائے ہیں۔ اس کی ممتاز محل بیوی اسے اپنا بادشاہ، شہنشاہ اور سرتاج مانتی ہے۔

ان کا ایک بیٹا بھی ہے شاہزادہ سلیم کی طرح...

اماں کی ڈھیر ساری اولاد ہیں پھر بھی وہ پہلوٹھی اولاد سلیم کو بھول نہ پاتیں۔ ان کا سلیم سے لگاؤ کچھ زیادہ ہی تھا۔

وہ جتنا سلیم بھائی کے بارے میں الٹی سیدھی اطلاعات پاتیں، ان کا دکھ بڑھتا جاتا۔ وہ زار و قطار آنسو بہاتیں اور اللہ رسول سے اس کے لیے دعائیں مانگا کرتیں۔

پیر غلام سے اماں نے سلیم کی چوری سے بہو اور بچے کی تصویریں بھی منگوائی تھیں۔ اس تصویر میں سلیم بھائی کسی مولانا جیسا دکھائی دے رہا تھا اور اس کی بیوی برقعے کا گھونگھٹ پلٹ کر چہرہ باہر نکالے تھی۔ ان کا بچہ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے روئی کا گولا ہو۔ اماں اپنی صندوقچی میں اس تصویر کو سنبھال کر رکھتی ہے۔

یونس نے نہو چچا سے پوچھا۔ ”کیا خبر آئی ہے؟“

یونس کے سامنے کیبل ٹی وی کے ذریعے نشر کیے جا رہے گجرات کی دل دہلانے والے واقعات پھیل گئے۔

گودھرا سانحہ کے بعد گجرات میں مارکاٹ مچی ہوئی ہے۔ تمام اخبار اور ٹی وی کے نیوز چینل گجرات کے فسادات کو عام لوگوں کے سامنے لانے میں بھڑے ہوئے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک نیوز رپورٹر کیمرے کی ٹیم کے ساتھ جہاں تہاں گھسے پڑے ہیں تا کہ فساد کی لائیو کوریج بنا سکیں۔

تا کہ ان کے چینل کی ٹی آر پی اچانک بڑھ جائے۔

تا کہ ان کی رپورٹس سے میڈیا میں تہلکہ مچ جائے۔

”یہ دیکھیے، ہاتھ میں پٹرول سے بھری بوتلیں لیے عورتیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ دیکھیے ہرے رنگ میں رنگا ایک خاص ذات کے لوگوں کا مکان، پردے کے پیچھے سے جھانکتی برقع اوڑھے عورتیں، چھت پر اینٹ پتھر جمع کرتے بچے، نمازیں ادا کرتے بزرگ اور یہ دیکھیے کس طرح تڑاتڑ بوتلیں پھینکی جا رہی ہیں... اس کی خصوصی کوریج صرف اسی چینل پر آپ دیکھ رہے ہیں

... یہ دیکھئے ہمارے نامہ نگار کے ساتھ عوام کیسا برتاؤ کر رہی ہے... لوگ ہمارا کیمرا توڑ کر پھینک دینا چاہتے ہیں... اس سڑک پر دیکھئے پولیس کے سپاہی خاموش کھڑی بھیڑ کو موقع دے رہے ہیں ... وہ دیکھئے ایک حاملہ عورت کس طرح بھاگنا چاہ رہی ہے... کس طرح ترشول اور لاٹھیاں لیے، پیشانی پر گیروا رنگ کی پٹی باندھے نوجوان اس عورت کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو گئے ہیں... اور... اور... یہ رہا اس عورت کے پیٹ کو ترشول کی نوک سے چیرا جانا... دیکھئے کس طرح ترشول کی نوک پر بغیر پیدا ہوئے بچے کو بھیڑ کے سروں پر کھلے آسمان میں لہرایا جا رہا ہے... یاد رکھئے یہ لائیو کوریج ہمارے چینل پر ہی دکھلایا جا رہا ہے... ہمارے جانباز رپورٹروں نے ابھی کچھ دن پہلے افغانستان میں امریکی حملے کے دوران امریکی فوجیوں کی بہادری اور دہشت گردوں کی ناکامیوں کا آنکھوں دیکھا حال آپ لوگوں تک پہنچا کر میڈیا کی دنیا میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا... اور اب گجرات میں عمل کے بعد کے فطری ردعمل کو پوری ایمانداری کے ساتھ آپ کو لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے۔ رات نو بجے پورے واقعہ پر پھر ایک بار نگاہ رکھتا ہوا ہمارا ''فساد خاص'' پروگرام دیکھنا نہ بھولیں۔ اس پروگرام کے اسپانسر ہیں ہیرے جواہرات کے تاجر، چرس، ہیروئین کے اسمگلر، جوتا، صابن، کنڈوم اور نیپکنس کے نرماتا...

نیوز کے دوسرے تیسرے چینل بھی یہی سب دکھا رہے ہیں۔ سبھی دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ جو ٹی وی پر دکھایا جا رہا ہے، وہ سب پہلی بار انہیں کے چینل والوں نے دکھایا ہے۔ کہ پورے واقعات پر مسلسل نظر رکھی جا رہی ہے۔ کہ ہمارے نمائندے اپنی جان خطرے میں ڈال کر فساد کی قابل اعتماد اور آنکھوں دیکھی خبریں مسلسل بھیج رہے ہیں۔ کہ صرف ہمارا چینل پیش کر رہا ہے خشخشی داڑھی والے وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم سے براہ راست بات چیت۔ وزیر اعلیٰ، وزیر داخلہ اور وزیر اعظم کٹہرے میں۔ صرف آپ کے لیے... جسے سپانسر کر رہے ہیں چڈی بنیان، شیتل پے اور بیئر کے نرماتا...

اپوزیشن میں بیٹھے لوگ، جن کے دامن پر جانے کتنے فسادات کے داغ لگے تھے، جنہوں نے اپنے دور حکومت میں بابری مسجد شہید ہونے دی تھی، گھڑیالی آنسو بہا رہے تھے۔

گجرات کی سلگتی آگ میں ان کے غیر فرقہ وارانہ کارکن کہاں تھے، اس طرح مشکل وقت میں ان کا رول کیا تھا؟ کیا وہ کبھی ان سوالات کا جواب دے پائیں گے؟

پوزیشن اوراپوزیشن دونوں پارلیمنٹ میں بیٹھے آپس میں نوک جھونک کررہے تھے کہ اپوزیشن کے دور میں کتنے فسادات ہوئے۔ سن چوراسی کے سکھ مخالف فساد کے اعداد و شمار کے آگے تو گجرات میں کچھ زیادہ نہیں ہوا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ پلٹ لیں، ہر فسادات میں عورتوں کی عصمت دری ہوئی ہے۔ موجودہ حکومت کے دور میں ہوئے ''اس فطری ردعمل کے کام'' میں آنکڑا اتنا زیادہ نہیں ہے۔ اکثریت کے غصے کو دبانا صورت حال کو اور خوفناک بنا سکتا تھا، اس لیے حکومت نے انہیں تھوڑا سا موقع ہی تو دیا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پالیں۔ ابھی تو کم ہی حادثات ہوئے ہیں۔

ملیٹری حکم کے انتظار میں کیمپوں میں سزائیں بھگت رہی تھی۔

پولیس ایسے وقت میں خاموش تماشائی بنے رہنے کے تاریخی کردار پر مستعدی سے عمل کر رہی تھی۔

ٹی وی پر آتی خبروں سے پھر گجرات آہستہ آہستہ غائب ہوتا گیا کہ ننہو چچا یہ کیسی خبر لے کر آ گئے۔

پیر غلام نے فون پر کیا بات کہی کہ ننہو چچا رات کے بارہ بجے خبر پہنچانے چلے آئے..

یونس کا من کسی انہونی کے خدشہ سے پریشان ہو رہا تھا۔

ننہو چچا چارپائی پر بیٹھے رہے۔

پھر انہوں نے یونس سے پانی مانگا۔

لگتا ہے کہ بیبیا کی نیند کھل گئی تھی۔

وہ ابھی بھی نیند اسی تھی۔

یونس نے اس سے چچا کے لیے پانی لانے کو کہا۔

تبھی دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

لگتا ہے کہ ابا ہیں، شاید ٹرین سے واپس آئے ہوں۔

یونس نے لپک کر دروازہ کھول دیا، واقعی ابا ہی تھے۔

ننہو چچا نے انہیں سلام کیا اور پھر ابا کے لیے بھی ایک گلاس پانی منگوایا۔

ابا نے جب پانی پی لیا تو ننہو چچا نے کھکھار کر گلا صاف کیا اور ابا کے گلے لگ کر رو

پڑے۔ ''اپنا سلیم نہیں رہا... وہ فساد میں مارا گیا!''

یونس کو کاٹو تو خون نہیں۔

بیبیا تو دہاڑ مار کر رو پڑی۔

یہ اچانک کیسی خبر سن رہا تھا پریوار...

ایک دم غیر متوقع خبر...

ابا کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ''صاف صاف بتائیں کہ کیا بات ہے؟''

نہو چچا کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ''ادھر جب سے گجرات سلگا ہوا تھا، میرے بیٹے پیر غلام کی بھی کوئی خبر نہیں مل پا رہی تھی۔ بعد میں پیر غلام کا فون ملا کہ وہ ٹھیک ہے۔ معاملہ جب ٹھنڈا ہوا تو پیر غلام ڈرتے ڈرتے آپ کے بیٹے سلیم کے محلے میں گیا تھا۔ وہاں اسے پتہ چلا کہ سلیم تبلیغی جماعت سے چالیس دن بعد واپس لوٹ رہا تھا۔ جماعت کے لوگ اسٹیشن سے الگ الگ آٹو بک کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ سلیم فسادیوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔ سلیم کو آٹو کے ساتھ جلا کر مار ڈالا گیا۔ تبلیغی جماعت والوں نے ہی واقعہ کی خبر اس کے سسرال میں پہنچائی تھی۔ سسرال والے اس امید میں تھے کہ شاید سلیم جان بچا کر کہیں چھپا ہوگا اور معاملہ ٹھنڈا ہونے پہ لوٹ آئے گا، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وہ خبر صحیح تھی۔ اس آٹو کے ساتھ سلیم بھی جل کر خاک ہو گیا تھا۔''

یونس کو پیر غلام کی بات یاد ہو آئی جو سلیم بھائی کو ''لادین'' کے نام سے یاد کیا کرتا۔ تبلیغی جماعت سے منسلک ہونے کی وجہ سے سلیم بھائی کی شکل بالکل اسامہ بن لادین کی طرح نظر آتی تھی۔

یونس کو اس کا لباس اور اس کی پہچان لے ڈوبی۔

ایک بار یونس خالو کے علاج کے لیے پی جی آئی لکھنؤ گیا تھا۔

وہاں ایک مولوی نما بزرگ نظر آئے تو عادتاً اس نے انہیں سلام کیا۔

وہ بہت ناراض دکھلائی دے رہے تھے۔

کیسا زمانہ آ گیا۔ حد ہو گئی بھائی۔ یہ ڈاکٹر جنہیں فرشتہ بھی کہا جاتا ہے، مسلمان مریضوں سے چڑھتے ہیں۔ جان جاتے ہیں کہ مریض مسلمان ہے تو پھر علاج میں لاپرواہی کرتے ہیں۔ سارے کافر ڈاکٹر آر ایس ایس کے ایجنٹ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ''میم'' کا صحیح

علاج نہ ہونے پائے۔

تھوڑی سی حجت کی نہیں کہ علاج ایسا کر دیں گے کہ ریکشن ہو جائے گا، دوا کوئی فائدہ نہ کرے گی۔

یونس نے ان مولوی صاحب کی بات کی تردید کی۔''ارے نہیں مولوی صاحب، ایک دم غلط کہہ رہے ہیں آپ! بھلا بتائیے، ہم بھی تو مسلمان ہیں، لیکن ہم نے تو ایسا کوئی تعصب یہاں نہیں ہوتے دیکھا۔ڈاکٹر بچارے مریض کو تندرست کرنے میں لگے رہتے ہیں۔''

پھر اس نے مولوی صاحب کا من بدلنے کے لیے کہا۔''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟''

انہوں نے کہا۔''جون پور ضلع کا رہنے والا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، لیکن آپ کی یہ شکایت واجب نہیں کہ ڈاکٹر مریضوں سے تعصب کرتے ہیں۔بیماری جتنی بڑی ہوگی، ڈاکٹر اتنے سیریس رہتے ہیں۔''

''دنیا دیکھی ہے میں نے بیٹے، تم مسلمان ضرور ہو، لیکن تمہارا رہن سہن ایک عام ہندو شہری کی طرح ہے۔اس لیے تم ہندوؤں کے درمیان کھپ جاتے ہو۔ہمیں دیکھ کر کوئی بھی جان لیتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔وہ ہم سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔سوچتا ہوں کہ اس ملک کے علماء یہ فتویٰ جاری کر دیں کہ مسلمانوں کو داڑھی رکھنے کی سنت سے چھوٹ مل جائے۔''

یونس ان بزرگ کی بات سن کر کانپ گیا تھا۔

## چار

پنکج ادھاس کی غزل کا ایک شعر یونس کو یاد ہو آیا۔

دنیا بھر کی یادیں ہم سے ملنے آتی ہیں
شام ڈھلے، اس سونے گھر میں میلہ لگتا ہے
دیواروں سے مل کر رونا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

زندگی کے اس پڑاو پر دنیا بھر کی یادیں یونس کا پیچھا کر رہی تھیں۔
ابا، اماں، خالہ، خالو، سلیم بھائی، بڑکی، سندھی پھل والا، صنوبر، ملکیتے، چھنگو، جمال صاحب، ڈاکٹر، بنے استاد، منو بھائی مستری، یادو جی، بانو اور بھی نہ جانے کتنے جانے انجانے چہرے، ہر چہرے کی ایک الگ داستان...
اس کی نیند اچٹ چکی تھی۔
چوپن کٹنی مسافر کسی اسٹیشن پر رکی۔
برتھ پر پسرے پسرے اس نے جھک کر کھڑکی کے باہر جھانکا۔
تبھی سادھو مہاراج بڑبڑائے۔"لگتا ہے بیوہاری آگوا۔"
یونس اٹھ بیٹھا۔
بیوہاری میں پسینجر کچھ دیر رکتی ہے۔
سنگرولی اور کٹنی کے درمیان بیوہاری ہی وہ جگہ ہے جہاں چائے پانی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔

وہ ٹرین سے نیچے اترا۔

سامنے ہی چائے مل رہی تھی۔

سردی یہاں بھی کافی تھی۔

وہ کانپتے ٹھٹھرتے چائے کے اڈے تک پہنچا۔

ٹی ٹی ای، گارڈ اور ڈرائیور چائے سڑک رہے تھے۔

پولی تھین کے کپ میں اس نے بھی چائے لی۔ اپنے ہاتھوں کو اس گرم چائے کے کپ میں سینکا اور چائے سڑکنے لگا۔

چائے پی کر اس نے سگریٹ سلگا لی اور اپنی بوگی کی طرف چل پڑا۔

بوگی میں چڑھ کر وہ سنڈاس میں گھس کر باقی بچی سگریٹ پینے لگا، دیواروں پر لکھی عبارتوں کو غور سے پڑھتے ہوئے پیشاب کیا۔

واپس اپنی برتھ پر آ کر وہ بیٹھ گیا۔

سادھو مہاراج کے بغل میں عورت لمبی لمبی لیٹ چکی تھی۔

سادھو مہاراج بیٹھے بیٹھے سو رہے تھے۔ دونوں ایک ہی کمبل میں تھے۔

یونس نے ائیر بیگ کھول کر اپنی ڈائری نکالی۔

ڈائری کے پہلے صفحے پر صنوبر کی دستِ تحریر میں یونس کا نام ہندی اور انگریزی میں درج تھا۔

ساتھ میں بہت ساری ذاتی معلومات لکھی ہوئی تھیں۔ جیسے ایڈریس کی جگہ پر خالو کے کواٹر کا پتہ۔ گاڑی نمبر کی جگہ پر خالو کے اسکوٹر کا نمبر۔ ٹیلی فون نمبر کی جگہ پانڈے پی سی او کا فون نمبر۔

دوسرے صفحے پر یادگار تاریخوں کے لیے جگہ تھی۔

اس میں صنوبر نے یونس کی اور اپنی تاریخ پیدائش لکھی ہوئی تھی۔

یونس: 1 / جولائی 1980

صنوبر: 20 / اکتوبر 1987

ڈائری کے ایک صفحے پر صنوبر نے اپنے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا۔

پسند کا رنگ: پنک

پسند کا کھانا: چکن بریانی

پسند کی مٹھائی: رس ملائی

پسند کا ٹی وی پروگرام: انتا کشری

کس سے نفرت کرتی ہو: دھو کے بازوں سے

کسے پیار کرتی ہو: ''مائی'' سے

یونس جانتا ہے کہ ''مائی'' کا مطلب کیا ہے؟ ''مائی'' صنوبر کا کوڈ ورڈ ہے۔

مائی یعنی ایم اور وائے۔

ایم سے محمد اور وائے سے یونس۔

آج کل کی لڑکیاں کتنی ہوشیار ہوتی ہیں۔ یونس ہنس پڑا۔

پھر اس نے کئی صفحات پلٹے۔

کہیں کوئی گانا لکھا تھا، کہیں نعت شریف، کہیں قوالی اور کہیں شعر و شاعری۔

ڈائری کے آخر میں ایک لفافہ رکھا تھا۔ جس پر لکھا ہوا پتہ اس نے ایک بار دوبارہ پڑھا۔

ٹو،

میسرز مہتا کول ایجنسی

ٹرانسپورٹ نگر، کوربا، چھتیس گڑھ

اور بھیجنے والے کے ایڈریس کی جگہ لکھا تھا۔

پونیت کھنہ

منیجر

مہتا کول ایجنسی

سنگرولی، سیدھی، مدھیہ پردیش

لفافے کے اندر پونیت کھنہ صاحب نے ایم سی اے کی کوربا یونٹ کے منیجر کا نام ایک سفارشی خط لکھا تھا۔

جناب،

خط حامل شخص محمد یونس پیلوڈور اور پوکلین آپریٹر ہے۔ وہ سنگرولی یونٹ کا ایک ایماندار، ٹیکنیکلی ٹرینڈ، کمرشیلی سب سے بہتر کارکن ہے۔ خاندانی وجوہات سے محمد یونس، اپنا ٹرانسفر کوربا

میں چاہ رہا ہے۔

اس لیے آپ اسے کور بایونٹ میں کام دے سکتے ہیں۔

آپ کا

پونیت کھنہ

یونس اس خط کو پہلے بھی کئی بار پڑھ چکا تھا۔

اسے فخر ہوا کہ اللہ کے رحم وکرم سے اب اس کی اپنی ایک آزاد پہچان بن چکی ہے۔

اس نے خط کو ڈائری میں رکھا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

گارڈ کی چلنے کی آواز آئی اور پھر ٹرین کی سیٹی گونجی۔

ٹرین چل پڑی۔

کھٹر......کھٹ کھٹ......

کھٹر......کھٹ کھٹ......

صبح تک کٹنی پہنچے گی ٹرین...

یونس کو نیند نے کب اپنی آغوش میں لے لیا، اسے پتہ نہ چل سکا............

☆☆☆

(Novel)

# PEHCHAN

by

## Anwer Sohail

Translated by

## Md Nehal Afroz

## سوانحی کوائف

نام : محمد نہال

قلمی نام : محمد نہال افروز

پیدائش : 6/جولائی 1988

والد کا نام : احمد علی

والدہ کا نام : نجمہ بیگم

ابتدائی تعلیم : مدرسہ اسلامیہ ہائیر سیکنڈری اسکول، بھمئی دیوان گنج، پھول پور، الہ آباد

ایم۔اے : الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

ایم۔فل : مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

پی ایچ۔ڈی : مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد (جاری)

مستقل پتہ : امین گنج دیوان گنج، پھول پور، الہ آباد، اتر پردیش-212402

موبائل نمبر : 9032815440،9616085785

ای میل : mdnehalafroz@gmail.com



EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com


978-93-5073-995-2